ناول

نثری اصناف میں ناول اس وقت دنیا کی مقبول ترین صنفوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ ناول دنیا بھر کی زبانوں میں لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔ مختلف ادیبوں نے اپنے اپنے طور پر ناول کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن زندگی ہی کی طرح ناول کی بھی کوئی ایسی تعریف ممکن نہیں جسے مکمل یا قطعی کہا جاسکے۔ پھر بھی ناول کا اطلاق سادہ اور سلیس زبان میں لکھی گئی ایسی طویل اور بھرپور کہانی پر کیا جاسکتا ہے جس میں عام زندگی کے حالات و واقعات، مسائل و معاملات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہو۔

روایتی ناول کے عام اجزائے ترکیبی میں پلاٹ، کردار نگاری، منظر نگاری، مکالمہ نگاری اور مرکزی خیال کو شمار کیا جاتا ہے۔ ان میں پلاٹ اور کردار نگاری کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ علاوہ اس کے، ناول میں زندگی کے مشاہدے اور انسانوں کے نفسیاتی مطالعے سے بھی کچھ لکھنے والوں نے بہت کام لیا ہے۔ ہر ناول کسی نہ کسی نظریۂ حیات کا حامل ہوتا ہے۔ اسی بنا پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ناول مصنّف کے نظریۂ حیات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

اردو زبان میں ناول نگاری کا آغاز انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوا۔ یہ دور دو تہذیبوں کے تصادم اور کشمکش کا دور تھا، جس پر بڑی شدّت کے ساتھ انگریزی ادب کے اثرات بھی پڑ رہے تھے۔ نذؔیر احمد، رتن ناتھ سرشاؔر، عبدالحلیم شرؔر اور مرزا محمد ہادی رسوؔا اردو کے اہم ترین ناول نگار کہے جاتے ہیں۔ بیسویں صدی میں اردو ناول نے بڑی ترقی کی۔ اس عہد کے ناول نگاروں میں پریم چند، عزیز احمد، حیات اللہ انصاری، کرشن چندر، عصمت چغتائی، ممتاز مفتی، قرۃ العین حیدر، عبد اللہ حسین، شوکت صدیقی، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، انتظار حسین، قاضی عبدالستار، جیلانی بانو اور جوگندر پال وغیرہ اہم ہیں۔

ناول کی صنف نے مغربی ناول، خاص طور پر انگریزی اور روسی ناول سے گہرے اثرات قبول کیے ہیں۔ پچھلے کچھ برسوں میں قدیم ہندوستانی فکشن کے اسالیب سے بھی بعض لکھنے والوں نے بہت روشنی حاصل کی ہے۔ چنانچہ اردو کی پرانی داستانوں، کتھا سرت ساگر اور الف لیلہ کی روایت کا اثر بھی چند نئے ناول نگاروں کے یہاں دیکھا جاسکتا ہے۔

© NCERT not to be republished

منشی پریم چند

1880 تا 1936

پریم چند کی پیدائش بنارس کے ایک گاؤں لمہی میں ہوئی۔ اُن کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔ کنبے کے لوگ نواب رائے بھی کہتے تھے۔ دادا گُرسہائے لال، پٹواری تھے اور والد عجائب لال ڈاک خانے میں منشی تھے۔ والدہ آنندی دیوی کے مائیکے کے لوگ بھی تعلیم یافتہ تھے۔

پریم چند کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسے میں ہوئی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد 1899 میں بنارس کے قریب چنار گڑھ کے ایک مشن اسکول میں اسسٹینٹ ماسٹر کی حیثیت سے ملازم ہوگئے۔ اسی زمانے میں ادب کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا۔ چنار مشن اسکول کے بعد، جولائی 1900 میں بہرائچ کے ضلع اسکول میں ماسٹر کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔ اسی سال ستمبر میں، فرسٹ ایڈیشنل ماسٹر کی حیثیت سے اُن کا تبادلہ پرتاپ گڑھ ہوگیا۔ 1902 میں تدریس کی باقاعدہ تربیت حاصل کرنے کے لیے الہ آباد کے ٹریننگ کالج میں داخلہ لیا اور فرسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل کی۔ اسی زمانے میں انھوں نے ہندی اور اردو اسپیشل ورنا کیولر کا امتحان بھی پاس کیا۔ ٹریننگ کے بعد 1904 میں الہ آباد کے ایک ماڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر رہے۔ 1905 میں کان پور کے ضلع اسکول میں ماسٹر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ جون 1909 میں مہوبہ، ضلع ہمیر پور (یوپی) کے لیے تبادلہ ہوگیا اور تدریس کے بجائے اسکول کے معائنے کا کام سپرد کیا گیا۔ مہوبہ کے قیام کے دوران 1916 میں انٹرمیڈیٹ اور 1919 میں گورکھپور کے زمانۂ قیام میں الہ آباد یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور پر بی۔اے۔ کا امتحان پاس کیا۔ تحریک عدمِ تعاون کے دوران گورکھ پور کے ایک جلسہ میں مہاتما گاندھی کے ایما پر انھوں نے 1920 میں سرکاری نوکری چھوڑ کر تصنیف وتالیف کو ہی معاش کا ذریعہ بنالیا۔

پریم چند کو مضامین لکھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ اُن کی پہلی تصنیف ایک ڈراما تھا جو انھوں نے تقریباً تیرہ سال کی عمر میں لکھا تھا۔ اس کا عنوان تھا: ایک ماموں کا رومان۔ یہ ڈراما شائع نہیں ہوا۔ پریم چند کے ابتدائی دور کے مضامین اور ایک ناول بنارس کے ہفتہ وار اخبار ''آوازِ خلق'' میں شائع ہوئے۔ ناول کا عنوان تھا: اسرارِ معابد۔ یہ اخبار کے اکتوبر 1903 سے فروری 1905 تک

© NCERT not to be republished

کے شمارے میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ اس پر مصنف کا نام ''دھنپت رائے عرف نواب رائے الہ آبادی'' لکھا جاتا تھا۔ پریم چند کا دوسرا ناول ''ہم خُرما وہم ثواب'' ہے جو غالباً 1906 میں کانپور سے منشی دیانرائن نگم نے شائع کیا تھا۔ وہ ایک ماہانہ رسالہ ''زمانہ'' بھی شائع کرتے تھے، جس میں پریم چند کے بہت سے مضامین، تبصرے اور افسانے شائع ہوئے۔ 1910 تک اُن کی تصانیف نواب رائے کے نام سے چھپتی رہیں۔ پریم چند کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''سوزِ وطن'' بھی نواب رائے کے نام سے شائع ہوا تھا لیکن جب حکومت کو محسوس ہوا کہ اِن کہانیوں میں وطن سے محبت اور آزادی حاصل کرنے کی ترغیب، پڑھنے والوں میں بغاوت کا جذبہ پیدا کرسکتی ہے تو مجموعہ ضبط کرلیا گیا۔ مصنّف سے کہا گیا کہ وہ آئندہ جو کچھ لکھے وہ کلکٹر کو دکھا کر اور اجازت لے کر چھپنے کے لیے بھیجے۔ اِس پابندی کے بعد انھوں نے اپنا قلمی نام پریم چند رکھ لیا۔ رسالہ ''زمانہ'' کے دسمبر 1910 کے شمارے میں اُن کی کہانی ''بڑے گھر کی بیٹی'' شائع ہوئی۔

پریم چند کے ناول ''اسرارِ معابد'' اور ''سوزِ وطن'' میں شامل کہانیوں کا یہ پہلو بہت واضح ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے سماج کی برائیوں اور انگریزی حکومت کی چال بازیوں سے عوام کو آگاہ کیا۔ اس طرح وہ اپنے معاشرے کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ پریم چند کے اس ارادے کی وجہ ہندوستانی معاشرے میں پھیلا ہوا انتشار تھا۔

دیہات اور شہروں کی یہ حالت دیکھتے ہوئے ملک کے بڑے سیاسی رہنماؤں، خاص کر گاندھی جی کی طرح، پریم چند نے بھی محسوس کیا کہ اِس بھیانک بگاڑ کی جڑ غلامی کی مٹّی اور فضا کی وجہ سے مضبوط ہو رہی ہے۔ لہٰذا ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کے بعد ہی یہاں کے غریب لوگ انسانوں کی طرح جی سکیں گے۔ اپنے اس احساس کو سیاسی لوگوں نے جدوجہدِ آزادی کا روپ دیا اور پریم چند نے اپنے اِس احساس کو تحریر میں ڈھال کر ناولوں اور افسانوں کے ذریعے عوام تک پہنچایا۔

پریم چند کی سوانح پڑھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کے جیسے جیسے دور دیکھے، انھیں کسی ذہین اور حسّاس شخص کی طرح اپنے دل و دماغ پر نقش کرلیا۔ ان پر غور کرنے کے بعد، یہ فیصلہ کیا کہ زندگی کی ان سچائیوں کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے ناولوں، افسانوں اور مضامین سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ اپنے تجربوں اور مشاہدوں کو عوام تک پہنچانے کے لیے، پریم چند نے بہت سادہ، سلیس اور پُر اثر زبان کا ستعمال کیا۔ اُن کے قلم سے نکلی ہوئی باتیں، پڑھنے والے کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ وہ اردو کے ساتھ ساتھ روز مرّہ کی ہندی کے الفاظ بھی مناسب جگہوں پر استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے ناولوں اور افسانوں میں مقصد پرستی اور سماجی فلاح و بہبود کے احساس کے ساتھ ساتھ دل چسپ کردار اور مزاحیہ کردار بھی ہیں۔ پریم چند نے ان کے ذریعے زندگی کا خوش گوار پہلو پیش کیا ہے اور پڑھنے والوں پر واضح کیا ہے کہ آدمی سخت سے سخت حالات میں بھی، زندگی

© NCERT not to be republished

سے جی لگانے اور دکھوں کو برداشت کرنے کے پہلو نکال ہی لیتا ہے۔

پریم چند کے ناولوں کا ماحول اور اُن کے کردار زیادہ تر دیہات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ پریم چند بھی، گاندھی جی اور ٹیگور وغیرہ کی طرح، اِس حقیقت سے واقف تھے کہ ہندوستان کی اصل آبادی گاؤں میں بستی ہے اور گاؤں کے باشندوں کی سادگی اور معصومیت ہندوستانی معاشرے کی روح کا ایک ناگزیر جزو ہے۔

آپ نے اپنی پچھلی جماعتوں میں داستان اور افسانے پڑھے ہیں۔انھیں پڑھتے ہوئے آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ داستان کا مصنف کردار یا واقعے کا بیان کئی زاویے اختیار کرتا ہے اور بہت تفصیل سے کام لیتا ہے۔ افسانے کا مصنّف، داستان لکھنے والے کے مقابلے میں، بہت اختصار کے ساتھ اور اشاروں کنایوں میں اپنی بات کہتا ہے۔ اِن اشاروں کنایوں کی تہہ تک پہنچنے کے لیے پڑھنے والے کو بہت چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ اگر اُس کی نظر سے کوئی فقرہ یا لفظ چوک جائے تو افسانے کے معنی خبط ہو سکتے ہیں۔ یہ صورت ناول میں نہیں ہوتی کیوں کہ اس میں کردار اور واقعات اکثر پورے پھیلاؤ کے ساتھ بیان ہوتے ہیں۔

ناول ''بیوہ'' کے آغاز میں دان ناتھ اور امرت رائے کی باتوں پر غور کیجیے، تو اندازہ ہو جائے گا کہ پریم چند نے تین چار صفحات میں ہی وہ خیال اپنے پڑھنے والوں پر اچھی طرح واضح کر دیا ہے، جس پر ناول کی تعمیر ہوئی ہے۔

آپ کی اِس کتاب میں ناول ''بیوہ'' کے ابتدائی نو باب شامل ہیں تا کہ آپ اِس صنفِ ادب سے بخوبی متعارف ہو سکیں۔ پریم چند کا ناول بہت مختصر ہے، یعنی صرف 182 صفحات کا۔ یہ چند صفحات پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ پریم چند کتنے دردمند دل کے مالک تھے۔ اُن کی یہ دردمندی اور انسان دوستی اُن کے تمام ناولوں میں مرکزی قوّت کا درجہ رکھتی ہے۔

پریم چند نے افسانوں کی طرح اپنے ناولوں میں بھی دیہات کے ساتھ ساتھ، شہر کے مسائل کا بیان کیا ہے۔ اُن کے زیادہ تر ناول ایسے ہیں کہ جو شہری اور دیہی زندگی میں بٹے ہوئے ہیں مگر ''گئو دان'' اور ''بازارِ حسن'' میں شہر اور گاؤں یکجا ہیں اور ایک دوسرے کے مقابل رکھے ہوئے آئینے بن گئے ہیں۔

ناول ''بیوہ'' پڑھنے سے پہلے، اگر یہ بات آپ کے ذہن میں رہے کہ خود پریم چند نے بھی اپنی دوسری شادی ایک بال بیوہ شیورانی دیوی سے کی تھی تو آپ پریم چند کے کردار کے ایک اہم پہلو سے واقف ہو جائیں گے۔ پریم چند ادیب کے ساتھ ساتھ ایک سرگرم سماجی مصلح بھی تھے اور ادب کے ذریعے انھوں نے قومی اصلاح اور تعمیر کا بیڑا بھی اٹھایا تھا۔

© NCERT not to be republished

بیوہ

کاشی کے آریہ مندر میں پنڈت امر ناتھ کی تقریر ہو رہی ہے، ناظرین مسحور سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ پروفیسر دان ناتھ نے آگے کھسک کر اپنے دوست بابو امرت رائے کے کان میں کہا ''رٹی ہوئی تقریر ہے۔''

امرت رائے اسپیچ سننے میں محو تھے۔ اس کا جواب نہ دیا۔

دان ناتھ نے پھر کہا ''صاف رٹی ہوئی تقریر ہے۔ یہاں بیٹھنا فضول ہے، ٹینس کا وقت نکلا جا رہا ہے۔''

امرت رائے نے پھر بھی کچھ جواب نہ دیا۔ آخر دان ناتھ نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ ''بھئی میں تو جاتا ہوں۔''

امرت رائے نے ان کی طرف بغیر دیکھے ہی کہا ''جاؤ شوق سے۔''

''تم کب تک بیٹھے رہو گے؟''

''میں تو آخر تک تقریر سن کر آؤں گا۔''

''بالکل بغلول ہو۔ یہ آخر اس تقریر میں ہے کیا؟''

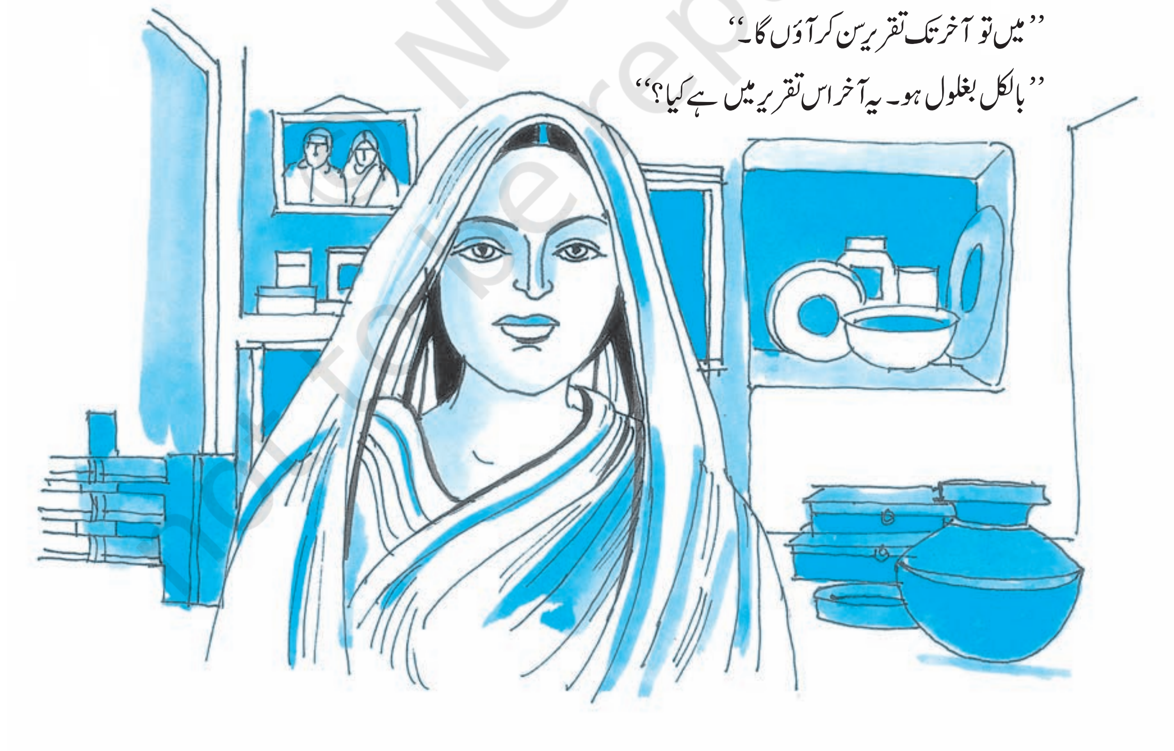

© NCERT not to be republished

''تو تم جاؤ۔ میں تمھیں جبراً روکتا تو نہیں۔''

''اجی گھنٹوں بولے گا۔ رانڈ کا چرخہ ہے یا تقریر ہے۔''

''سننے بھی دو، بیکار بک بک کررہے ہو۔ تمھیں جانا ہو تو جاؤ۔ میں تقریر ختم کرکے ہی اٹھوں گا۔''

''پچھتاؤ گے۔ آج پریما بھی کھیلنے آئے گی۔''

''تم اس سے میری طرف سے معافی مانگ لینا۔''

''مجھے کیا غرض ہے کہ آپ کی طرف سے معافی مانگوں۔''

دان ناتھ آسانی سے گلا چھوڑنے والے آدمی نہ تھے۔ گھڑی نکال کر دیکھی، پہلو بدلا اور بے صبری کے انداز سے پھر امرت رائے کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کی توجہ تقریر کی طرف نہیں، مقرر کی ڈاڑھی کی طرف تھی۔ ڈاڑھی کی جنبش پیہم میں انھیں بڑا مزا آرہا تھا۔ کچھ نہ کچھ بولتے رہنے کا مرض تھا۔ ایسا دلچسپ نظارہ دیکھ کر خاموش کیسے رہتے ؟ امرت رائے کا ہاتھ دبا کر بولے ''آپ کی ڈاڑھی کتنی صفائی سے ہل رہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ نوچ کر رکھ دوں۔''

امرت رائے نے مکدّر ہوکر کہا ''تم بڑے بدنصیب ہو کہ ایسی دل آویز اور پُر اثر تقریر کا لطف نہیں اُٹھا سکتے۔''

مقرّر نے کہا۔ ''میں آپ صاحبوں کے روبرو تقریر کرنے نہیں کھڑا ہوا ہوں۔''

دان ناتھ۔(آہستہ سے) ''اور کیا آپ گھاس کھودنے آئے ہیں۔''

مقرّر۔ ''باتیں بہت ہو چکیں اب عمل کا موقع ہے۔''

دان ناتھ ۔(آہستہ سے) ''جب آپ کی زبان آپ کے قابو میں رہے۔''

مقرر۔ ''جو اصحاب اپنی رفیق زندگی کا داغ اٹھا چکے ہیں وہ براہ کرم اپنے ہاتھ اٹھائیں۔''

دان ناتھ۔(دبی آواز سے) ''افوہ! یہاں تو آدھے سے زیادہ رنڈوے نکل آئے۔''

مقرر۔ ''جو اصحاب اس خیال سے متفق ہوں کہ رنڈووں کو کنواریوں سے شادی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے وہ براہِ کرم اپنے ہاتھ اٹھائیں۔''

صرف ایک ہاتھ اٹھتا ہے! یہ بابو امرت رائے کا ہاتھ ہے۔ اہلِ جلسہ ان کی طرف پُرسوال دلچسپی کی نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔

دان ناتھ نے امرت رائے کے کان میں کہا ''یہ کیا بیہودہ حرکت ہے؟ ہاتھ نیچے کرو۔''

امرت رائے ۔''میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں اس سے بہتر دوسرا معاشرتی اصول نہیں ہے۔''

© NCERT not to be republished

مقرر نے امرت رائے کو ان کی اخلاقی جرأت پر مبارک باد دی۔ چند جملوں میں ناظرین کی پست ہمتی پر افسوس کیا اور بیٹھ گئے۔ جلسہ ختم ہو گیا۔

اہل جلسہ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے، دان ناتھ بھی باہر چلے آئے مگر امرت رائے ابھی تک محویت کی حالت میں دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دان ناتھ نے ایک منٹ تک باہر کھڑے ہو کر انتظار کیا، تب اندر جا کر بولے

''ارے اب تو چلو گے یا یہیں ڈھئی دو گے؟''

امرت رائے نے چونک کر کہا ''ہاں ہاں چلو۔''

دونوں دوست آ کر موٹر میں بیٹھے، موٹر چل پڑی۔

دان ناتھ کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ پوچھا ''آج تمھیں یہ حماقت کیا سوجھی'' امرت رائے نے تمسخر کے انداز سے جواب دیا '' وہی سوجھی جو تمھیں سوجھی۔''

''پریما سنے گی تو کیا کہے گی؟''

''بے حد خوش ہوگی۔'' کم سے کم اسے خوش ہونا چاہیے۔ اپنے احباب کو فرض کے سامنے سر جھکاتے دیکھ کر کون خوش نہیں ہوتا؟''

دان ناتھ نے ملامت کی ''اجی جاؤ بھی، باتیں بناتے ہو۔ اسے تم سے کتنی محبت ہے یہ تم سے پوشیدہ نہیں ہے، ابھی شادی نہیں ہوئی (حالانکہ تم خود اس کے ذمہ دار ہو) یہ درست ہے۔ لیکن سارا شہر جانتا ہے کہ وہ تمھاری منگیتر ہے سوچو اس کے اور تمھارے درمیان کتنی خط کتابت ہو چکی ہے۔ وہ دل میں تمھیں اپنا شوہر تسلیم کر چکی ہے، ایسی نازنین تمھیں دنیا کے پردے پر نہیں ملے گی۔ یہ سمجھ لو کہ تمھاری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ اپنے ساتھ اس کی زندگی بھی خراب کر دو گے۔ فرض کے نام پر جو چاہو کرو مگر پریما کو دل سے نہیں نکال سکتے۔''

امرت رائے متانت سے بولے ''یہ سب میں خوب سمجھ رہا ہوں بھائی جان، لیکن میرا ضمیر کہہ رہا ہے کہ مجھے اس سے شادی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، پنڈت امرناتھ کی تقریر نے میری آنکھیں کھول دیں۔''

امرناتھ کا نام آتے ہی دان ناتھ نے ناک سکوڑ کر کہا۔

''کیا کہنا ہے واہ! اس نے رٹ کر ایک تقریر کر دی اور تم لٹو ہو گئے۔ یہ اچھا اصول ہے کہ جس کی پہلی بیوی مر چکی ہو وہ کسی کنواری لڑکی سے شادی نہ کرے۔''

امرت رائے نے کہا'' انصاف تو یہی کہتا ہے۔''

دان ناتھ بولے'' تو بس ایک تمھارے انصاف پر چلنے سے قوم کی نجات ہوجائے گی،تم تنہا کچھ نہیں کر سکتے ، ہاں نکو بن سکتے ہو۔''

امرت رائے نے پر زور نظروں سے تاکتے ہوئے کہا'' آدمی تنہا بھی بہت کچھ کرسکتا ہے۔تنہا آدمیوں نے خیالات میں انقلاب پیدا کردیے ہیں۔ دنیا کی صورت بدل دی ہے۔ افراد کی داستانِ عمل سے تاریخیں پُر ہیں۔گوتم بدھ کون تھا؟ وہ تنہا حق کی تلاش میں نکلا تھا اور اس کے دوران حیات میں ہی آدھی دنیا اس کے قدموں پر سر جھکا چکی تھی، افراد کے نام سے قوموں کے نام روشن ہیں،قومیں تباہ ہوگئیں آج ان کا نشان بھی باقی نہیں،مگر مخصوص ہستیوں کے نام ابھی باقی ہیں۔میں اکیلا کچھ نہ کرسکوں، یہ دوسری بات ہے۔اکثر جماعتیں بھی کچھ نہیں کرسکتیں۔میرا خیال ہے کہ جماعتیں کبھی کچھ نہیں کرسکتیں،لیکن آدمی اکیلا کچھ نہیں کرسکتا، میں اس کلیّے کو کبھی تسلیم نہ کروں گا۔''

دان ناتھ سہل پسند آدمی تھے۔کسی اصول کے لیے تکلیف اٹھانا انھوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ایک کالج میں پروفیسر تھے۔گیارہ بجے جاتے تھے۔دو بجے لوٹ آتے تھے۔باقی سارا وقت کتب بینی اور سیر و تفریح میں اڑا دیتے تھے۔

اس کے برعکس امرت رائے اصول پرور آدمی تھے اور بڑے دھن کے پکے۔ایک بار کوئی فیصلہ کرکے اس سے منحرف نہ ہوتے تھے۔پیشہ وکالت تھا مگر اس پیشے سے انہیں نفرت تھی۔بنائے ہوئے مقدمے بھول کر بھی نہ لیتے تھے،لیکن جو مقدمہ لے لیتے اس کے لیے جان لڑا دیتے تھے۔یہی سبب تھا، انہیں ناکامی کا صدمہ بہت کم اٹھانا پڑتا تھا۔ان کی پہلی شادی اس وقت ہوئی تھی جب وہ کالج میں پڑھتے تھے۔ایک لڑکا بھی پیدا ہوا لیکن زچہ اور بچّہ دونوں زچّہ خانہ ہی میں داغ مفارقت دے گئے۔امرت رائے کو اپنی بہن سے بڑی محبت تھی۔انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب کبھی شادی نہ کروں گا لیکن جب بہن کی شادی ہوگئی اور والدین بھی ایک ہفتہ کے اندر ہیضے کے شکار ہوگئے تو سونا گھر پھاڑ کھانے لگا۔دو سال سیر و سیاحت میں بسر کیے، لوٹے تو ہولی کے دن ان کے سُسر نے اس تقریب میں ان کی دعوت کی، وہ امرت رائے کے اطوار پر پہلے ہی سے فدا تھے۔ان کی چھوٹی لڑکی پریما اب شادی کے قابل ہوگئی تھی۔اس کے لیے امرت رائے سے بہتر شوہر انھیں دوسرا نظر نہ آیا۔دو سال قبل امرت رائے نے پریما کو دیکھا تھا۔ وہ شگفتہ کلی اب ایک شگفتہ پھول تھی جس کی نزاکت اور لطافت آنکھوں کو لبھاتی تھی۔امرت رائے کا غم نصیب دل یہاں سے محبت کا اثر لے کر لوٹا۔تب سے جب طبیعت گھبراتی سسرال چلے جاتے اور دو گھڑی ہنس بول کر چلے آتے۔ ایک دن ان کی ساس نے ان سے مطلب کی بات کہہ دی، امرت رائے تو پریما کے رنگ و بو پر پہلے ہی نثار تھے۔اندھے کو جیسے آنکھیں مل گئیں۔شادی طے ہوگئی اسی

© NCERT not to be republished

مہینے شادی ہونے والی تھی کہ آج امرت رائے نے عام جلسے میں اس نئے اصول کو تسلیم کر کے اپنا ارادہ فسق کر دیا۔

دان ناتھ نے ان کی لمبی تقریر سن کر کہا ''تو تمھارا یہ قطعی فیصلہ ہے۔''

''بیشک۔''

''اور پریما کو جواب دو گے؟''

''اسے مجھ سے بہت اچھا شوہر مل جائے گا۔''

دان ناتھ نے دلسوزی کے ساتھ کہا ''کیا باتیں کرتے ہو۔تم سمجھتے ہو، محبت کوئی بازار کا سودا ہے۔جی چاہا لیا، جی چاہا نہ لیا۔مگر تمھارا یہ خیال غلط ہے۔پریما محض تمھاری منگیتر نہیں ہے، تمھاری معشوقہ بھی ہے۔یہ خبر پا کر اس کے دل کی کیا کیفیت ہوگی۔شاید اس کا اندازہ تم نہیں کر سکتے۔میں تو یہی کہوں گا کہ تم اپنے ساتھ ہی نہیں اس کے ساتھ بھی بڑی بے انصافی کر رہے ہو۔''

امرت رائے ایک لمحہ کے لیے فکر میں ڈوب گئے۔اپنے متعلق تو انھیں ذرا بھی اندیشہ نہ تھا، وہ اپنے تئیں فرض پر نثار کر سکتے تھے۔لیکن پریما کا کیا حال ہوگا، اس کا خیال انھیں نہ آیا تھا۔ہاں اتنا وہ جانتے تھے کہ پریما بلند خیال عورت ہے اور ان کے ایثار کی اس کی نگاہوں میں ضرور وقعت ہوگی۔اگر وہ اتنی ہی فرض شناس ہے جتنا میں سمجھتا ہوں تو میرے اس فیصلے پر اسے مطلق رنج نہ ہوگا۔میرا خیال ہے کہ اسے خوشی ہوگی، کم از کم مجھے یہ امید ضرور ہے۔''

دان ناتھ نے منہ بنا کر کہا ''تم سمجھتے ہو گے کہ بڑا میدان مار آئے ہو اور جو سنے گا وہ پھولوں کا ہار لے کر تمھارے گلے میں ڈالنے دوڑے گا۔لیکن میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ تم محض شہرت کے بھوکے ہو۔لیکن عورتوں کو شہرت کی اتنی ہوس نہیں ہوتی۔پریما کتنی ہی پاکیزہ خیال ہو وہ یہ کبھی پسند نہ کرے گی کہ تم اس سے اتنی بے دردی کے ساتھ کنارہ کش ہو جاؤ۔''

امرت رائے کا بنگلہ آ گیا۔موٹر رک گیا۔امرت رائے اتر کر اپنے کمرہ کی طرف چلے۔دان ناتھ ذرا اس انتظار میں کھڑے رہے کہ یہ مجھے بلائیں تو میں جاؤں، لیکن جب امرت رائے نے ان کی طرف پھر کر بھی نہ دیکھا تو انہیں خوف ہوا کہ شاید میری باتیں انھیں ناگوار گزریں۔کمرے کے دروازے پر جا کر بولے ''کیوں بھائی مجھ سے ناراض ہو گئے۔؟''

امرت رائے نے پرنم آنکھوں سے دیکھ کر کہا ''نہیں دان ناتھ تمھاری جھڑکیوں میں مزا ہے جو دوسروں کی واہ واہ میں نہیں۔میں جانتا ہوں تم نے اس وقت جو کہا ہے وہ محض محبت سے کہا ہے، دل میں تو تم خوب سمجھتے ہو کہ میں شہرت کا حریص نہیں بلکہ زندگی میں کچھ کام کرنا چاہتا ہوں۔''

دان ناتھ نے اندر جا کر امرت رائے کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے ''پھر سوچ لو۔ایسا نہ ہو پیچھے پچھتانا پڑے۔''

© NCERT not to be republished

امرت رائے نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔'' اس کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ بھائی جان سچ پوچھو تو آج میں اپنے دل میں جس عالی ہمتی کا احساس کر رہا ہوں، وہ ایک نیا تجربہ ہے۔ آج کئی ماہ کی کشمکش کے بعد میں نے اپنے اوپر فتح پائی ہے۔ مجھے پریما سے جتنی محبت ہے، اس سے کئی گنی محبت میرے ایک دوست کو اس سے ہے۔ اس شریف آدمی نے کبھی بھول کر بھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا لیکن میں جانتا ہوں اس کی محبت کتنی جاں سوز، کتنی گہری اور کتنی پاکیزہ ہے۔ میں تقدیر کی کتنی چوٹیں سہہ چکا ہوں۔ ایک چوٹ اور بھی سہہ سکتا ہوں۔ لیکن میرے اس دوست نے ابھی ناکامی کی ایک چوٹ بھی نہیں سہی ہے اور یہ ناکامی اس کے لیے سوہانِ روح ہو جائے گی۔''

یہ اشارہ کس کی طرف تھا، دان ناتھ سے مخفی نہ رہا۔ جب امرت رائے کی بیوی کا انتقال ہوا اسی وقت پریما سے دان ناتھ کی شادی کا تذکرہ درپیش تھا۔ جب پریما کی بہن کا انتقال ہو گیا تو اس کے والد لالہ بدری پرشاد نے دان ناتھ کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ دان ناتھ علم، دولت اور وقار، کسی بات میں بھی امرت رائے کے مدمقابل نہ تھے۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ پریما بھی امرت رائے کی جانب زیادہ متوجہ معلوم ہوتی تھی۔ دان ناتھ اتنے مایوس ہوئے کہ طے کر لیا کبھی شادی نہ کروں گا۔ دونوں دوستوں میں ذرا بھی کدورت نہ پیدا ہوئی۔ دان ناتھ یوں بظاہر تو ہمیشہ خوش رہتے تھے لیکن دنیا سے ان کا دل بیزار ہو گیا تھا۔ زندگی بار معلوم ہوتی تھی۔ امرت رائے کو اپنے دلی دوست کی حالت پر افسوس ہوتا تھا اور وہ اپنے دل کو اس آزمایش کے لیے مہینوں سے تیار کر رہے تھے لیکن پریما جیسی عدیم المثال نازنین سے دست بردار ہو جانا آسان نہ تھا۔ ایسی حالت میں دان ناتھ کا یہ اصرار دوستانہ ہمدردی پر اتنا زیادہ مبنی نہ تھا جتنا امرت رائے کے جذبۂ ایثار کی گہرائی تک پہنچنے کی خواہش پر، جس تمنا کو انھوں نے سینہ کو چیر کر نکال ڈالا تھا۔ جس کے پورے ہونے کی اس کی زندگی میں مطلق امید نہ تھی، وہی تمنا آج ان کے سینے میں مشعل کی طرح روشن ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی امرت رائے کے اس ملکوتی ایثار نے ان کے دل پر بہت گہرا اثر پیدا کیا۔ رقت آمیز لہجے میں بولے'' تو کیا اسی خیال سے تم نے آج یہ فیصلہ کر لیا۔ اگر تمھارا وہ دوست اس فیصلے سے فائدہ اٹھائے تو میں کہوں گا کہ وہ تمھارا دوست نہیں دشمن ہے۔ اور پھر کیا معلوم ہے کہ اس حالت میں پریما کی شادی تمھارے دوست سے ہی ہو۔''

امرت رائے نے تشویش ناک لہجے میں کہا'' ہاں یہ اندیشہ ضرور ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ میرا دوست اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دے گا۔''

دان ناتھ نے افسردہ خاطر ہو کر کہا'' تم اسے اتنا کمینہ سمجھنا چاہو تو سمجھ لو لیکن میں کہے دیتا ہوں کہ میں اس دوست کو پہچان سکا ہوں تو وہ اپنے عوض تمھیں ناکامی کا شکار نہ بننے دے گا۔''

© NCERT not to be republished

یہ کہتے ہوئے دان ناتھ باہر نکل آئے اور امرت رائے دروازے پر کھڑے انھیں پر غرور نگاہوں سے دیکھتے رہے وہ دل میں کہہ رہے تھے، اس شخص میں کتنا ضبط ہے۔''

(2)

ادھر دونوں دوستوں میں باتیں ہو رہی تھیں ادھر لالہ بدری پرشاد کے گھر میں ماتم سا چھایا ہوا تھا۔ بڑی دیر کے بعد ان کی بیوی دیوکی نے کہا ''تم ذرا امرت رائے کے پاس چلے کیوں نہیں جاتے؟''

بدری پرشاد نے اعتراض کے انداز سے کہا'' جا کر کیا کروں۔''

''جا کر سمجھاؤ اور کیا کروگے۔''

''میں اس چھوکرے کے پاس نہیں جا سکتا۔''

''آخر کیوں؟ کوئی ہرج ہے۔''

''اب تم سے کیا بتاؤں۔ جب مجھے اس کا فیصلہ معلوم ہو گیا تو میرا اس کے پاس جانا غیر مناسب ہی نہیں، اہانت آمیز ہے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ بدھوا بواہ (بِدھوا بیاہ) کے حامی ہیں۔ سمجھتے ہیں اس سے ملک آسمان پر پہنچ جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں بدھوا بواہ ملک کے لیے زہر قاتل ہے اس سے ہندو عظمت اور پاکیزگی کے رہے سہے نشان بھی مٹ جائیں گے۔ ایسی حالت میں ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔''

دیوکی نے جواب دیا'' یہ کوئی بات نہیں ہے۔ آج اگر ہمارا کملا مسلمان ہو جائے تو کیا ہم اس کے پاس آنا جانا چھوڑ دیں گے؟ ہم سے جہاں تک ہو سکے گا اسے سمجھائیں گے اور اسے سیدھے راستے پر لانے کی کوشش کریں گے۔''

دیوکی کے اس جواب سے بدری پرشاد کچھ نرم تو پڑے لیکن پھر بھی قائل نہ ہوئے۔ بولے'' بھئی میں تو اب امرت رائے کے پاس نہ جاؤں گا۔ تم اگر سوچتی ہو کہ وہ سمجھانے سے راہ راست پر آجائیں گے تو انھیں بلا لو، خود چلی جاؤ لیکن مجھ سے جانے کو نہ کہو، میں انھیں دیکھ کر شاید آپے سے باہر ہو جاؤں۔ کہو تو جاؤں؟''

دیوکی۔'' نہیں معاف کیجیے۔ اس سے تو یہی اچھا ہے کہ تم نہ جاؤ۔ میں کل انھیں بلا لوں گی۔

بدری۔'' بلانے کو بلا لو، لیکن یہ میں کبھی پسند نہ کروں گا کہ تم ان کی خوشامد کرو'' میں پریما کو ان کے گلے لگانا نہیں چاہتا۔ اس کے لیے بر کی کمی نہیں ہے۔''

دیوکی۔'' پریما ان لڑکیوں میں نہیں ہے کہ تم اس کی شادی جس کے ساتھ چاہو کر دو، ذرا جا کر اس کی حالت تو دیکھو تو معلوم

ہو، جب سے یہ خبر ملی ہے اکیلی چھت پر پڑی رو رہی ہے۔''

بدری-''اجی یہ تو لڑکیوں کا قاعدہ ہے، دس پانچ روز میں آپ ہی آپ سنبھل جائے گی۔''

دیوکی-''کون پریما؟ میں کہتی ہوں وہ اس غم میں رو کر جان دے دے گی۔ تم ابھی اسے نہیں جانتے۔'' بدری پرشاد نے جھنجھلا کر کہا ''اگر وہ رو رو کر مر جانا چاہتی ہے تو مر جائے لیکن میں امرت رائے کی خوشامد نہ کروں گا۔''

بدری پرشاد باہر چلے گئے، دیوکی بڑے شش و پنج میں پڑ گئی۔ شوہر کی عادت سے خوب واقف تھی۔ لیکن انھیں اتنا کج فہم اس نے نہ سمجھا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ امرت رائے سمجھانے پر اپنا فیصلہ تبدیل کر دیں گے لیکن ان کے پاس کیسے جائے، شوہر سے راڑ کیسے مول لے۔

دفعتاً پریما اوپر سے آ کر چارپائی کے پاس کھڑی ہو گئی، اس کی آنکھیں سرخ تھیں، دیوکی نے سمجھا کر کہا ''رومت بیٹی۔ میں کل انھیں بلا لوں گی، میری بات وہ کبھی نہ ٹالیں گے۔''

پریما نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا ''نہیں اماں آپ کے پیروں پڑتی ہوں، ان سے کچھ نہ کہیے۔ میں کارِ خیر میں رکاوٹ نہیں ڈالنا چاہتی۔ انھوں نے ہماری بدنصیب بہنوں کی خاطر یہ فیصلہ کیا ہے۔ ہمارے یہاں کتنے ایسے آدمی ہیں جو اتنی جرات کر سکیں۔ میں ان کے اس نیک ارادہ میں حائل نہ ہوں گی۔''

دیوکی نے حیرت زدہ نگاہوں سے پریما کو دیکھا۔ لڑکی کیا کہہ رہی ہے، ان کی سمجھ میں نہ آیا۔

پریما پھر بولی ''اگر ایسے نیک طبیعت اور روشن خیال آدمی قربانیاں نہ کریں گے تو کون کرے گا؟''

دیوکی نے پوچھا ''اور تو، اپنے دل کو کیسے سمجھائے گی بیٹی۔ اس خیال سے تجھے تسکین ہوگی؟''

پریما نے متانت سے جواب دیا ''مجھے اس کا بالکل دکھ نہیں ہے' اماں جی! میں آپ سے سچ کہتی ہوں، میں بھی اس کام میں ان کی مدد کروں گی۔ جب تک آپ لوگوں کا ہاتھ میرے سر پر ہے مجھے کس بات کی فکر ہے۔ آپ لوگ میرے لیے ذرا بھی اندیشہ نہ کریں۔ میں کنواری رہ کر بہت سکھی رہوں گی۔''

دیوکی نے پراشک نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''ماں باپ کس کے سدا بیٹھے رہتے ہیں بیٹی! اپنی آنکھوں کے سامنے ذرا جو کام ہو جاوے وہی اچھا۔ لڑکی تو ان کی بھی کنواری نہیں رہنے پاتی جن کے گھروں میں کھانے کا ٹھکانا نہیں ہے۔ بھیک مانگ کر لوگ لڑکی کا بیاہ کرتے ہیں۔ محلّہ میں کوئی لڑکی یتیم ہو جاتی ہے تو چندہ سے اس کا بیاہ کر دیا جاتا ہے، میرے یہاں کس بات کی کمی ہے؟ میں تمھارے لیے کوئی اور لڑکا تلاش کروں گی۔ یہ جانے سنے آدمی تھے۔ اتنا ہی تھا ورنہ برادری میں ایک سے ایک پڑے ہوئے ہیں۔ میں کل تمھارے بابو جی کو بھیجتی ہوں۔''

پریما کا دل کانپ اٹھا۔ آج تین برس سے امرت رائے کی مورت کو اپنے دل کے مندر میں بٹھا کر وہ پوجتی چلی آئی تھی، اس مورت کو اس کے دل سے کون نکال سکتا تھا۔ دل میں اس مورت کو بٹھائے ہوئے کیا وہ کسی دوسرے شخص سے بیاہ کر سکتی تھی؟ وہ بیاہ ہوگا یا بیاہ کا ڈھونگ؟ اس زندگی کا خیال کتنا خوفناک، کتنا دل ہلا دینے والا تھا؟ پریما نے زمین کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔

''نہیں اماں جی! میرے لیے کوئی فکر نہ کریں۔ میں نے کنواری ہی رہنے کا قصد کر لیا ہے۔''

''بابو کملا پرشاد کی آمد آمد کا شور سنائی دیا، آپ سنیما کے بے طرح دلدادہ تھے۔ روز ہی جایا کرتے تھے۔ نوکروں سے وہ سختی کے ساتھ کام لیتے تھے۔ خصوصاً باہر سے آنے پر تو کسی ایک کی مرمّت سے باز نہ رہ سکتے تھے۔ ان کے بوٹ کی چر چراہٹ سنتے ہی نوکروں میں ہلچل پڑ جاتی تھی۔

کملا پرشاد نے آتے ہی کہار سے پوچھا ''برف لائے؟''

کہار نے دبی زبان سے کہا ''ابھی تو نہیں سرکار۔''

کملا پرشاد نے گرج کر کہا ''زور سے بولو، برف لائے یا نہیں؟ منہ میں زبان نہیں ہے۔''

کہار کی آواز اب بالکل بند ہوگئی۔ کملا پرشاد نے کہار کے دونوں کانوں کو پکڑ کر ملاتے ہوئے کہا ''ہم پوچھتے ہیں برف لائے یا نہیں؟''

کہار نے دیکھا کہ اب بغیر منہ کھولے ہوئے کانوں کے اکھڑ جانے کا احتمال ہے تو آہستہ سے بولا۔ نہیں سرکار!

کملا – کیوں نہیں لائے؟

کہار – پیسے نہ تھے۔

کملا – کیوں پیسے نہ تھے؟ گھر میں جا کر مانگے تھے؟

کہار – ''ہاں سرکار کسی نے سنا نہیں۔''

کملا – ''جھوٹ بولتا ہے۔ میں جا کر دریافت کرتا ہوں، اگر معلوم ہوا کہ تو نے پیسے نہیں مانگے تو کچا ہی کھا جاؤں گا راسکل۔''

کملا پرشاد نے کپڑے بھی نہیں اتارے۔ غصہ میں بھرے ہوئے گھر میں جا کر ماں سے پوچھا ''کیوں اماں! بدلوتم سے برف کے لیے پیسے مانگنے آیا تھا۔''

دیوکی نے بغیر ان کی طرف دیکھے ہی کہا ''آیا ہوگا، یاد نہیں آتا، بابو امرت رائے سے ملاقات تو نہیں ہوئی؟

کملا – ''نہیں ان سے تو ملاقات نہیں ہوئی۔ ان کی طرف گیا تھا لیکن جب سنا کہ وہ کسی جلسہ میں گئے ہیں تو میں سنیما

© NCERT not to be republished

دیکھنے چلا گیا۔ جلسوں کا تو انھیں مرض ہے اور میں بالکل فضول سمجھتا ہوں، کوئی فائدہ نہیں۔ بغیر لکچر سنے بھی آدمی زندہ رہ سکتا ہے اور لکچر دینے والوں کے بغیر دنیا کے پاتال میں چلے جانے کا اندیشہ نہیں۔ جہاں دیکھو لکچرار ہی لکچرار نظر آتے ہیں۔ برساتی مینڈکوں کی طرح ٹرٹر کیا اور چلتے ہوئے۔ اپنا وقت کھویا اور دوسروں کو پریشان کیا۔ سب کے سب بیوقوف ہیں۔''

دیوکی۔''امرت رائے نے تو آج ناؤ ہی ڈبو دی، اب کسی بدھوا سے بیاہ کرنے کی ٹھان لی ہے'' کملا پرشاد نے زور سے قہقہہ لگا کر کہا'' اور یہ جلسے والے کریں گے کیا؟ یہی تو ان سبھوں کو سوجھتی ہے۔ لالہ اب کسی بیوہ سے شادی کریں گے؟ اچھی بات ہے میں ضرور بارات میں جاؤں گا۔ خواہ اور کوئی جائے یا نہ جائے۔ ذرا دیکھوں نئے ڈھنگ کی شادی کیسی ہوتی ہے۔ وہاں بھی سب لکچر بازی کریں گے۔ ان لوگوں کے لیے اور کیا ہوگا۔ سب کے سب بیوقوف ہیں۔ عقل کسی کو چھو نہیں گئی۔''

دیوکی۔''تم ذرا ان کے پاس چلے جاتے۔''

کملا۔''اس وقت تو بادشاہ بھی بلائے تو نہ جاؤں۔ ہاں کسی روز جا کر ذرا خیر و عافیت پوچھ آؤں گا۔ مگر ہے پورا خبطی! میں تو جانتا تھا کہ اس میں کچھ سمجھ ہوگی مگر نرا بونگا نکلا! اب بتاؤ زیادہ پڑھنے سے کیا فائدہ ہوا؟ بہت اچھا ہوا کہ میں نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ بہت پڑھنے سے عقل ماری جاتی ہے۔ جب آنکھیں کمزور ہو جاتی ہیں تو عقل کیسے بچی رہ سکتی ہے؟ تو کوئی بیوہ بھی ٹھیک ہوگئی یا نہیں؟ کہاں ہے مصرانی؟ کہہ دو کہ اب تمھاری چاندی ہے۔ کل ہی سندیس بھیج دیں۔ کوئی اور نہ جائے تو میں جانے کو تیار ہوں۔ بڑا مزا رہے گا! کہیں ہے مصرانی۔ اب ان کی قسمت کھل رہے گی۔ برادری ہی کی بیوہ ہے نا، کہ برادری کی قید بھی نہیں رہی؟۔

دیوکی۔ یہ تو نہیں جانتی اب کیا ایسے بھرشٹ (ناپاک) ہو جائیں گے۔

کملا۔'' یہ سبھا والے۔ جو کچھ نہ کر گزریں وہ تھوڑا۔ ان سبھوں کو بیٹھے بیٹھے ایسی بے پر کی اڑانے کی سوجھتی ہے۔ ایک روز پنجاب سے کوئی بوکھل (خبطی) آیا تھا کہہ گیا کہ ذات پات توڑ دو، کیوں کہ اس سے ملک میں پھوٹ بڑھتی ہے۔ بس سب کے سب بیٹھے یہی سوچا کرتے ہیں کہ کوئی نئی بات نکالنی چاہیے۔ گاندھی جی کو اور کچھ نہ سوجھی تو سوراج ہی کا ڈنکا پیٹ چلے۔ سبھوں نے عقل بیچ کھائی ہے۔'' اتنے ہی میں ایک حسینہ نے صحن میں قدم رکھا۔ کملا پرشاد کو دیکھ کر ڈیوڑھی پر ٹھٹک گئی۔ دیوکی نے کملا سے کہا۔

''تم ذرا کمرہ میں چلے جاؤ۔ پورنا ڈیوڑھی پر کھڑی ہے۔''

پورنا کو دیکھتے ہی پریما دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ گئی۔ پڑوس میں ایک پنڈت بسنت کمار رہتے تھے۔ کسی دفتر میں نوکر تھے، پورنا انھیں کی بیوی تھی، بہت ہی حسین، بہت ہی نیک، مکان میں کوئی دوسرا نہ تھا۔ جب دس بجے پنڈت جی دفتر چلے جاتے تو وہ یہیں چلی آتی اور دو سہیلیاں شام تک بیٹھی ہنستی بولتی رہتیں۔ پریما کو اس سے اتنی محبت تھی کی اگر کسی دن وہ کسی سبب سے نہ آتی،

© NCERT not to be republished

وہ خود اس کے یہاں جاتی۔ آج بسنت کمار کہیں دعوت میں گئے تھے، پورنا کا جی گھبرایا تو وہ یہاں چلی آئی۔ پریما اس کا ہاتھ پکڑے اوپر کمرے میں لے گئی۔

پورنا نے چادر الگنی پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمھارے بھیا آنگن میں کھڑے تھے اور میں منہ کھولے چلی آئی تھی۔ مجھ پر ان کی نظر پڑ گئی ہوگی۔''

پریما۔ ''بھیا میں کسی کو تاکنے کی لت نہیں ہے۔ یہی تو ان میں ایک گن (وصف) ہے۔ آپ کے پنڈت جی کہیں گئے ہیں کیا؟''

پورنا۔ ''ہاں آج ایک نیوتے (دعوت) میں گئے ہیں۔''

پریما۔ ''سبھا میں نہ گئے۔ آج تو بہت بھاری سبھا ہوئی ہے؟''

پورنا۔ ''وہ کسی سبھا سماج میں نہیں جاتے۔ کہتے ہیں کہ ایشور نے دنیا بنائی ہے اور وہی اپنی مرضی سے ہر بات کا بندوبست کرتا ہے۔ میں اس کے کاموں کو سدھارنے کی ہمت نہیں کرسکتا۔''

پریما۔ ''آج کی سبھا دیکھنے کے لائق تھی۔ تم ہوتیں تو میں بھی جاتی۔ سماج سدھار پر ایک مہاشے کا بڑا اچھا لکچر ہوا۔''

پورنا۔ ''عورتوں کے سدھار کا رونا رویا گیا تھا۔''

پریما۔ ''تو کیا عورتوں کے سدھار کی ضرورت نہیں ہے۔''

پورنا۔ ''پہلے مرد لوگ تو اپنی دشا (حالت) سدھار لیں۔ پھر عورتوں کی دشا سدھاریں گے۔ ان کی دشا سدھر جائے تو عورتیں آپ ہی آپ سدھر جائیں۔''

''ساری برائیوں کی جڑ مرد ہی ہیں۔''

پریما نے ہنس کر کہا۔ ''نہیں بہن! سماج میں عورت مرد دونوں ہی ہیں اور جب تک دونوں کا سدھار نہ ہوگا زندگی میں سکھ نہ ملے گا۔ مردوں کے ودوان ہونے سے کیا عورتیں ودوان ہو جائیں گی۔ مرد تو زیادہ تر سادے ہی کپڑے پہنتے ہیں۔ پھر عورتیں کیوں گہنوں پر جان دیتی ہیں۔ قیمتی کپڑوں کی تو کوئی بات نہیں۔ مردوں میں تو کتنے ہی بن بیاہ رہ جاتے ہیں۔ عورتوں کو کیوں بن بیاہا رہنے میں زندگی بیکار معلوم ہوتی ہے؟ بتاؤ میں تو سوچتی ہوں کہ بن بیاہا رہنے میں جو سکھ ہے وہ بیاہ کر رہنے میں نہیں۔''

پورنا نے آہستہ سے پریما کو دھکا دے کر کہا۔ ''چلو بہن تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو۔ بابو امرت رائے سنیں گے تو تمھاری خوب خبر لیں گے۔ میں انھیں لکھ بھیجوں گی کہ یہ اپنا بیاہ نہ کریں گی، آپ کوئی دوسرا دروازہ دیکھیں۔''

پریما نے امرت رائے کے عہد کا حال نہ کہا۔ وہ جانتی تھی کہ اس سے پورنا کی نگاہ میں ان کی قدر بہت کم ہوجائے گی۔ بولی ''وہ خود بیاہ نہ کریں گے۔''

پورنا - ''چلو جھوٹ بکتی ہو۔''

پریما - ''نہیں بہن جھوٹ نہیں۔ شادی کرنے کی ان کی خواہش نہیں ہے۔ دیدی (بڑی بہن) کے مر جانے کے بعد وہ کچھ تیاگی سے ہوگئے تھے۔ بابو جی کے بہت گھیرنے پر اور مجھ پر رحم کرکے وہ شادی کرنے پر تیار ہوئے تھے، مگر اب ان کا ارادہ بدل گیا ہے۔ اور میں بھی سمجھتی ہوں کہ جب ایک شخص خود گرہستی کے جھنجھٹ میں نہ پھنس کر سماج کی سیوا کرنا چاہتا ہے تو اس کے پیر کی بیڑی بننا ٹھیک نہیں ہے۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں پورنا، مجھے اس کا رنج نہیں ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی میں بھی کچھ کرے جاؤں گی۔''

پورنا کی حیرت بڑھتی ہی گئی بولی۔ ''آج چار بجے تک تم ایسی باتیں نہ کرتی تھیں۔ یکا یک یہ کیسی کایا پلٹ ہوگئی۔ انھوں نے کسی سے کچھ کہا ہے کیا۔''

پریما- ''بلا کہے بھی تو آدمی اپنی خواہش ظاہر کرسکتا ہے۔''

پورنا- ''میں ایک خط لکھ کر ان سے پوچھوں گی۔''

پریما- ''نہیں پورنا، تمھارے پیروں پڑتی ہوں، خط وط نہ لکھنا، میں کسی کے نیک ارادے میں رکاوٹ نہ ڈالوں گی، میں اگر اور کوئی مدد نہیں کرسکتی تو کم سے کم ان کی راہ کا کانٹا نہ بنوں گی۔''

پورنا- ''ساری عمر روتے کٹے گی کہے دیتی ہوں۔''

پریما - ''ایسا کوئی دکھ نہیں ہے جو آدمی سہہ نہ سکے۔ وہ جانتے ہیں کہ مجھے اس سے دکھ نہیں سکھ ہوگا۔ ورنہ وہ کبھی ایسا ارادہ نہ کرتے۔ میں ایسے حوصلے والے آدمی کا حوصلہ بڑھانا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ اسے گرہستی میں نہیں پھنسانا چاہتی۔ پورنا نے بے پروائی سے کہا۔ ''تمھاری مایا (لیلا) میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بہن، معاف کرنا۔ میں کبھی نہ مانوں گی کہ تم کو اس سے دکھ نہ ہوگا۔''

پریما- ''تو پھر انھیں بھی ہوگا؟''

پورنا- ''مردوں کا دل سخت ہوتا ہے۔''

پریما- ''تو میں بھی اپنا دل سخت بنالوں گی۔''

پورنا- ''اچھا بنالینا- لو اب نہ کہوں گی۔ لاؤ باجہ، تمھیں ایک گیت سناؤں پریما نے ہارمونیم سنبھالا اور پورنا گانے لگی۔''

(3)

ہولی کا دن آیا، محلے کے دو چار بے فکرے جمع ہو گئے۔ کوئی مرچ پیسنے لگا۔ کوئی بادام چھیلنے لگا۔ دو آدمی دودھ کا بندوبست کرنے کے لیے گئے دو آدمی سل بٹا دھونے لگے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔

دفعتاً بابو کملا پرشاد آ پہنچے۔ یہ جمگھٹا دیکھ کر بولے۔ ''کیا ہو رہا ہے بھئی! ہمارا بھی حصہ ہے نا؟''

بسنت کمار نے آگے بڑھ کر خیر مقدم کیا۔ بولے ''ضرور میٹھی پیجیے گا کہ نمکین؟''

کملا-اجی میٹھی پلاؤ نمکین کیا۔ مگر یار زعفران اور کیوڑا ضرور ہو۔ کسی کو بھیجیے۔ میرے یہاں سے لے آئے۔ کسی لڑکے کو بھیجیے جو اندر جا کر پریما سے مانگ لائے، کہیں بیوی صاحبہ کے پاس نہ چلا جائے ورنہ مفت گالیاں ملیں، تیوہار کے دن ان کا مزاج گرم ہو جایا کرتا ہے۔ یار بسنت کمار بیویوں کے خوش رکھنے کا آسان نسخہ بتاؤ میں تو عاجز آ گیا۔''

بسنت کمار نے مسکرا کر کہا۔ ''ہمارے یہاں تو یہ مرض کبھی نہیں ہوتا۔''

کملا-''تو یار تم بڑے خوش نصیب ہو، کیا پورنا تم سے کبھی نہیں روٹھتی؟''

بسنت-''کبھی نہیں۔''

کملا-''کبھی کسی چیز کے لیے ضد نہیں کرتی۔''

بسنت-''کبھی نہیں'' یہاں تو دوامی قید ہو گئی ہے اور گھڑی بھر بھی گھر سے باہر رہوں تو جواب طلب ہوتا ہے۔ سنیما روزانہ جاتا ہوں اور ہر روز گھنٹوں مناؤ کرنا پڑتا ہے۔''

بسنت-''تو سنیما دیکھنا چھوڑ دیجیے۔''

کملا-''واہ واہ۔ یہ تو تم نے خوب کہی، قسم اللہ پاک کی خوب کہی، جس کل وہ بٹھائے اسی کل بیٹھ جاؤں۔ پھر جھگڑا ہی نہ ہو۔ کیوں؟ اچھی بات ہے۔ کل دن بھر گھر سے نکلوں گا نہیں۔ دیکھوں تو تب کیا کہتی ہے۔ دیکھنا اب تک وہ چھوکرا زعفران اور کیوڑا لے کر نہیں لوٹا۔ کان میں بھنک پڑ گئی ہوگی، پریما کو منع کر دیا ہوگا۔ اب تو نہیں رہا جاتا۔ آج جو کوئی میرے منہ لگا تو برا ہوگا۔ میں ابھی جا کر سب چیزیں بھیجے دیتا ہوں۔ مگر جب تک میں نہ آؤں آپ تیار نہ کرائیے گا۔ یہاں اس فن کے استاد ہیں۔ موروثی بات ہے۔ دادا ایک تولہ کا ناشتہ کرتے ہیں۔ عمر میں کبھی ایک دن کا بھی ناغہ نہیں کیا، مگر کیا مجال کہ نشہ ہو جائے۔''

© NCERT not to be republished

یہ کہہ کر کملا پرشاد جھلائے ہوئے گھر چلے گئے۔ بسنت کمار کسی کام سے اندر گئے تو دیکھا کہ پورنا ابٹن پیس رہی ہے۔ پنڈت جی کے بیاہ کے بعد یہ دوسری ہولی تھی۔ پہلی ہولی میں بے چارے خالی ہاتھ تھے۔ پورنا کی کچھ خاطر نہ کر سکے تھے۔ مگر اب کے انھوں نے بڑی تیاریاں کی تھیں۔ محنت کر کے کوئی ڈیڑھ سو روپے پیدا کیے تھے۔ اس میں پورنا کے لیے ایک عمدہ ساڑھی لائے تھے۔ دو ایک چھوٹی موٹی چیزیں بھی بنوادی تھیں۔ پورنا آج وہ ساڑھی پہن کر انھیں اپسرا سی معلوم پڑنے لگی۔ پاس جا کر بولے۔ ''آج تو جی چاہتا ہے تمھیں آنکھوں میں بٹھا لوں۔''

پورنا نے ابٹن ایک پیالی میں اٹھاتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر کہا'' یہ دیکھو میں تو پہلے ہی بیٹھی ہوئی ہوں۔''

بسنت۔ ''ذرا اشنان کرتا آؤں۔ کملا بابو اب دس بجے سے پہلے نہ لوٹیں گے۔''

پورنا۔ ''پہلے ذرا یہاں آ کر بیٹھ جاؤ۔ ابٹن تو لگا دوں۔ پھر نہانے جانا۔''

بسنت۔ ''نہیں نہیں، رہنے دو۔ میں ابٹن نہ لگاؤں گا۔ لاؤ میری دھوتی دو۔''

پورنا۔ ''واہ ابٹن کیوں نہ لگاؤ گے۔ آج کی یہ رسم ہے۔ آ کے بیٹھ جاؤ۔''

بسنت۔ ''بڑی گرمی ہے۔ بالکل جی نہیں چاہتا۔''

پورنا نے لپک کر انکا ہاتھ پکڑ لیا اور ابٹن بھرا ہاتھ ان کے بدن پر پھیر دیا۔ بولی ''سیدھے سے کہتی تھی تو نہیں مانتے تھے۔ اب تو بیٹھو گے۔''

بسنت نے جھینپ کر کہا۔ ''مگر ذرا جلدی کرنا دھوپ ہو رہی ہے۔''

پورنا۔ ''اب گنگا جی کہاں جاؤ گے یہیں نہا لینا''

بسنت۔ ''نہیں۔ آج گنگا کنارے بڑی بہار ہوگی۔''

پورنا۔ ''اچھا تو جلدی لوٹ آنا۔ یہ نہیں کہ ادھر ادھر تیرنے لگو۔ نہاتے وقت تم بہت دور تک تیر جایا کرتے ہو۔''

پنڈت جی ابٹن لگوا کر نہانے کے لیے چلے گئے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ گھاٹ سے ذرا الگ نہایا کرتے تھے۔ تیراک بھی اچھے تھے۔ کئی بار شہر کے اچھے تیراکوں سے بازی جیت چکے تھے۔ اگرچہ آج گھر سے وعدہ کر کے چلے تھے کہ تیروں گا نہیں۔ مگر ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے اور صاف پانی میں اٹھتی ہوئی لہریں ایسی بھلی معلوم ہوتی تھیں کہ دل تیرنے کے لیے بے قرار ہو اٹھا۔ وہ فوراً پانی میں کود پڑے اور ادھر ادھر کلیلیں کرنے لگے۔ دفعتاً انھیں منجدھار میں کوئی سرخ چیز بہتی نظر آئی۔ غور سے دیکھا تو کنول تھے۔ آفتاب کی شعاعوں میں چمکتے ہوئے وہ ایسے خوشنما معلوم ہوتے تھے کہ بسنت کمار کا جی ان پر للچا گیا۔ سوچا کہ اگر یہ مل جائیں تو پورنا کے

© NCERT not to be republished

کانوں کے لیے جھومک بناؤں۔ اس کی خوشی کا اندازہ کر کے ان کا دل ناچ اٹھا۔ بیچ دھارے تک تیر جانا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہ تھی۔ انھیں پورا یقین تھا کہ میں پھول لاسکتا ہوں۔ جوانی دیوانی ہے۔ یہ نہ سوچا کہ جیوں جیوں میں آگے بڑھوں گا پھول بھی تو بڑھیں گے۔ ان کی طرف چلے اور کوئی پندرہ منٹ میں منجدھار میں پہنچ گئے۔

مگر وہاں جا کر دیکھا تو پھول اتنی ہی دور آگے تھے۔ اب کچھ تکان معلوم ہونے لگی تھی۔ مگر بیچ میں کوئی ریت بھی نہ پڑتی تھی جس پر بیٹھ کر دم لیتے۔ آگے ہی بڑھتے گئے کبھی ہاتھ کبھی پیروں سے زور لگاتے، پھولوں تک پہنچے۔ مگر اس وقت تک کل اعضا سست پڑ گئے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے جب پھولوں کو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھانا چاہا تو ہاتھ نہ اٹھ سکا۔ آخر ان کو دانتوں میں دبا لیا اور پلٹ پڑے۔ مگر جب وہاں سے انھوں نے کنارے کی طرف دیکھا تو ایسا معلوم ہوا گویا ہزاروں کوس کی منزل ہے۔ بدن بالکل نڈھال ہو گیا تھا اور پانی کا بہاؤ بھی خلاف تھا۔ ان کی ہمت چھوٹ گئی۔ ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ قریب کوئی کشتی یا ڈونگی نہ تھی اور کنارے تک آواز ہی نہ پہنچ سکتی تھی۔ سمجھ گئے یہیں غرق دریا ہونا پڑے گا۔ ایک لمحہ کے لیے پورنا کی یاد آئی۔ ہائے وہ ان کی راہ دیکھ رہی ہوگی۔ اسے کیا معلوم وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر چکے۔ بسنت کمار نے ایک بار پھر زور لگایا مگر ہاتھ پیر نہ ہل سکے۔ اب ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ کنارے پر سے لوگوں نے انھیں دیکھا۔ دو چار آدمی پانی میں کود پڑے۔ مگر ایک ہی لمحہ میں بسنت کمار لہروں میں سما گئے۔ صرف کنول کے پھول پانی میں تیرتے رہ گئے گویا زندگی کا خاتمہ ہو جانے کے بعد اس کی ناکام آرزوئیں اپنا خونیں جلوہ دکھا رہی تھیں۔

(4)

لالہ بدری پرشاد کی شرافت مشہور تھی۔ ان سے ٹھگ کر کوئی پیسہ بھی نہ لے سکتا تھا۔ مذہب کے معاملہ میں وہ بہت ہی فراخ دل تھے۔ خودغرضیوں سے وہ کوسوں بھاگتے تھے، مگر محتاجوں کی مدد کرنے میں کبھی نہ چوکتے تھے۔ پھر پورنا تو ان کی پڑوسن ہی نہیں برہمنی بھی تھی، اس پر ان کی لڑکی کی سہیلی، اس کی مدد وہ کیوں نہ کرتے؟ پورنا کے ساتھ دو چار معمولی گہنوں کے سوا اور کیا تھا۔ تیرھویں کے دن اس نے وہ سب گہنے لا کر لالہ جی کے سامنے رکھ دیے اور آبدیدہ ہو کر بولی۔ ''میں اب انھیں رکھ کر کیا کروں گی۔''

بدری پرشاد نے رقت آمیز لہجہ میں کہا ''میں انھیں لے کر کیا کروں گا بیٹی! تم یہ نہ سمجھو کہ میں دھرم یا پُن سمجھ کر یہ کام کر رہا ہوں۔ یہ میرا فرض ہے۔ ان گہنوں کو اپنے پاس رکھو۔ کون جانے کس وقت ان کی ضرورت پڑے۔ جب تک میں زندہ ہوں تمھیں اپنی بیٹی سمجھتا رہوں گا۔ تمھیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔''

تیرھویں بڑی دھوم سے ہوئی۔ کئی سو برہمنوں نے کھانا کھایا۔ دان دچھنا میں بھی کوئی کمی نہ کی گئی۔

رات کے بارہ بج گئے تھے۔ لالہ بدری پرشاد برہمنوں کو کھانا کھلا کر لوٹے تو دیکھا کہ پریما ان کے کمرے میں کھڑی ہے۔ بولے ’’یہاں کیوں کھڑی ہو بیٹی! رات بہت ہوگئی جا کر سو رہو۔‘‘

پریما – آپ نے ابھی کھانا نہیں کھایا ہے نا؟

بدری – اب اتنی رات گئے میں کھانا نہ کھاؤں گا۔ تھک بھی بہت گیا ہوں لیٹتے ہی سو جاؤں گا۔

یہ کہہ کر بدری پرشاد پلنگ پر بیٹھ گئے اور ایک لمحہ کے بعد بولے۔ ’’کیوں بیٹی پورنا کے مائیکہ میں کوئی نہیں ہے؟ میں نے اس سے نہ پوچھا کہ شاید اس کو رنج ہو۔‘‘

پریما – مائیکے میں کون ہے، ماں باپ پہلے ہی مر چکے تھے، ماما نے بیاہ کر دیا تھا۔ مگر جب سے بیاہ ہوا پھر کبھی جھانکے تک نہیں۔ سسرال میں بھی سگا کوئی نہیں ہے۔ پنڈت جی کے دم سے ناتا تھا۔

بدری پرشاد نے بستر کی چادر برابر کرتے ہوئے کہا ’’میں سوچتا ہوں کہ پورنا کو اپنے ہی مکان میں رکھوں تو کیا ہرج ہے؟ اکیلی عورت کیسے رہے گی؟‘‘

پریما – ہوگا بہت اچھا – مگر اماں جی مانیں تب تو۔

بدری – مانیں گی کیوں نہیں، پورنا تو انکار نہ کرے گی؟

پریما – ’’پوچھوں گی – میں سمجھتی ہوں کہ انھیں انکار نہ ہوگا۔‘‘

بدری – ’’اچھا مان لو کہ وہ اپنے ہی گھر میں رہے تو اس کا خرچ کوئی بیس روپیہ میں چل جائے گا۔‘‘

پریما نے احسان مند نگاہوں سے والد کی طرف دیکھ کر کہا ’’بڑے مزے سے۔ پنڈت جی پچاس ہی روپیہ تو پاتے تھے۔‘‘

بدری پرشاد نے تشویش کے لہجہ میں کہا ’’میرے لیے بیس، پچیس، تیس سب برابر ہیں۔ مگر مجھے اپنی زندگی ہی کی بات تو نہیں سوچنی ہے۔ اگر آج نہ رہوں تو کملا کل کوئی کوڑی چھوڑ کر نہ دے گا، اس کے لیے کوئی مستقل بندوبست کر دینا چاہتا ہوں۔ ابھی ہاتھ میں روپیہ نہیں ہے، ورنہ کل ہی چار ہزار روپیہ کسی معتبر بینک میں جمع کر دیتا۔ سود سے اس کی پرورش ہوتی رہتی۔ یہ شرط کر دیتا کہ اصل میں سے اس کو کچھ نہ دیا جائے۔‘‘

دفعتاً کملا پرشاد آنکھیں ملتے ہوئے آ کر کھڑے ہوئے اور بولے۔ ’’ابھی آپ سوئے نہیں۔ گرمی لگتی ہے تو پنکھا لا کر رکھ دوں۔ رات زیادہ ہوگئی۔‘‘

بدری۔''نہیں گرمی نہیں ہے۔ پریما سے کچھ باتیں کرنے لگا تھا۔تم سے بھی کچھ صلاح لینا چاہتا تھا۔تم آپ ہی آپ آ گئے۔ میں سوچتا ہوں پورنا یہیں آ کر رہے تو کیا ہرج ہے۔''

کملا پرشاد نے آنکھیں پھاڑ کر کہا'' یہاں اماں نہ راضی ہوں گی۔''

بدری۔'' اماں کی بات چھوڑ دو۔ تمھیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔''

کملا پرشاد نے زور دے کر کہا'' میں تو کبھی صلاح نہ دوں گا۔ دنیا میں سبھی طرح کے آدمی ہیں۔ نہ جانے لوگ کیا سمجھیں۔ ذرا دور تک سوچیے۔''

بدری۔'' اس کی پرورش کے لیے تو کوئی نہ کوئی انتظام کرنا ہی ہوگا۔''

کملا۔'' ہم کیا کر سکتے ہیں۔''

بدری۔'' تو اور کون کرے گا۔''

کملا۔'' شہر میں ہمیں تو نہیں ہیں؟ اور بہت سے مالدار لوگ ہیں۔ اپنی حیثیت کے مطابق ہم بھی کچھ امداد کریں گے۔''

بدری پرشاد نے تمسخر کرتے ہوئے کہا'' تو چندہ کھول دیا جائے۔کیوں؟ اچھی بات ہے تو جاؤ گھوم گھوم کر چندہ وصول کرو۔''

کملا۔'' میں کیوں چندہ جمع کرنے لگا۔''

بدری۔'' تب کون کرے گا؟''

کملا پرشاد نے اس معاملہ میں مطلق غور نہ کیا تھا۔ بے دلی سے بولا۔'' آخر آپ نے کوئی تجویز تو سوچی ہوگی جو مناسب سمجھیے وہ کیجیے۔''

بدری۔'' میں کیا کروں گا۔ میری تجویز کی اب وقعت ہی کیا ہے۔ چراغ سحری ہوں۔ میری زندگی کا کیا ٹھکانا۔ آج مرا کل دوسرا دن۔ میری آنکھیں بند ہوتے ہی تم سب درہم برہم کر ڈالو تو مفت میں اور بدنامی ہو۔''

کملا پرشاد نے بہت رنجیدہ ہو کر کہا'' آپ مجھے اتنا کمینہ خیال کرتے ہیں یہ مجھے معلوم نہ تھا۔''

بدری پرشاد بیٹے کو بہت زیادہ پیار کرتے تھے۔ یہ دیکھ کر کہ میری باتوں سے اسے صدمہ پہنچا ہے، انھوں نے فوراً بات بنائی۔'' نہیں نہیں میں تمھیں کمینہ نہیں سمجھتا۔ بہت ممکن ہے کہ آج ہم جو بات کر سکتے ہیں وہ کل کے حالات تبدیل ہو جانے کے بعد نہ کر سکیں۔''

کملا۔'' ایشور نہ کرے کہ میں وہ مصیبت جھیلنے کے لیے بیٹھا رہوں۔ لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ آپ جو کچھ کر جائیں گے،

اس میں کملا پرشاد کو بھی کسی حالت میں اعتراض نہ ہوگا۔ آپ گھر کے مالک ہیں۔ آپ ہی نے یہ دولت پیدا کی ہے۔ آپ کو اس پر پورا اختیار ہے۔ تجویز کرنے کے پیشتر میں جو چاہے کہوں۔ جب آپ ایک بات طے کر دیں گے تو میں اس کے خلاف زبان تک نہ ہلاؤں گا۔''

بدری۔ '' تو کل چار ہزار روپے پورنا کے نام بینک میں جمع کر دو اور یہ شرط لگا دو کہ وہ اصل میں سے کچھ نہ لے سکے۔ اس کے بعد روپے ہمارے ہو جائیں گے۔ کملا کو گویا چوٹ سی لگی۔ بولے'' خوب سوچ لیجیے۔''

بدری پرشاد نے تصفیہ کے لہجے میں کہا'' خوب سوچ لیا ہے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ وہ اسے منظور کرتی ہے یا نہیں۔''

کملا۔ '' کیا اس کی منظوری میں بھی کوئی شرط ہے۔''

بدری پرشاد نے حقارت آمیز لہجہ میں کہا'' تمھاری یہ بری عادت ہے کہ تم سب کو خود غرض سمجھنے لگتے ہو۔ کوئی شریف آدمی دوسروں کا احسان سر پر نہیں لینا چاہتا۔ انسان کی فطرت ہی ایسی ہے۔ گئے گذروں کی بات جانے دو لیکن جس میں خود داری کا ذرا بھی شائبہ ہے وہ دوسروں سے مدد نہیں لینا چاہتے۔ مجھے تو شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ پورنا کبھی اس پر رضا مند نہ ہوگی۔ وہ محنت کرے گی لیکن جب تک مجبور نہ ہو جائے ہماری مدد کو قبول نہ کرے گی۔ پریما نے بڑے جوش سے کہا'' مجھے بھی یہی شبہ ہے۔ راضی ہوگی بھی تو بڑی مشکل سے۔''

بدری۔ '' تم اس سے اس کا ذکر کرنا۔ کل ہی۔''

پریما۔ ''نہیں دادا، مجھ سے نہ بنے گا۔ وہ اور میں دونوں ہی اب تک بہنوں کی طرح رہی ہیں۔ مجھ سے اس طرح کی گفتگو اب کیسے ہوگی۔ میں تو رونے لگوں گی۔''

بدری۔ '' تو میں ہی طے کر لوں گا۔ ہاں کل شاید مجھے فرصت نہ ملے، تب تک تمھاری اماں سے باتیں ہوں گی۔ میرا خیال ہے وہ راضی ہو جائیں گی۔''

کملا پرشاد خانہ داری کے انتظام میں اپنے کو لاثانی سمجھتے تھے۔ یوں تو عقل میں وہ اپنے کو افلاطون سے رتّی بھر کم نہ سمجھتے تھے، لیکن خانہ داری میں تو ان کا کمال مسلمہ تھا۔ سینما روز دیکھتے تھے مگر کیا مجال جو جیب سے ایک پیسہ بھی خرچ کریں۔ منیجر سے دوستی کر رکھی تھی۔ اس کے یہاں کبھی کبھی دعوت کھا آیا کرتے تھے۔ پیسوں کا کام دھیلوں میں نکالتے تھے اور بڑی خوب صورتی سے کبھی کبھی لالہ بدری پرشاد سے اس معاملہ میں ان کی ٹھن بھی جایا کرتی تھی۔ بوڑھے لالہ جی بیٹے کی اس تنگ دلی پر کبھی کبھی کھری کھری کہہ ڈالتے تھے۔ کملا پرشاد سمجھ گئے کہ لالہ جی اس وقت کوئی اعتراض نہ سنیں گے بلکہ اعتراض سے ان پر الٹا ہی اثر پڑے گا۔

© NCERT not to be republished

اس لیے انھوں نے مصلحت سے کام لینے کا ارادہ کیا۔علی الصباح پورنا کے دروازے پر جا کر آواز دی۔ پورنا پہلے تو ان سے پردہ کرتی تھی مگر اب بہو بن کر بیٹھنے سے کام نہ چل سکتا تھا۔ انھیں اندر بلا لیا، کملا بابو اندر جا کر چار پائی پر بیٹھے۔ ایک لمحہ میں پورنا ان کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ پورنا کی پیشانی گھونگھٹ سے ڈھکی ہوئی تھی لیکن دونوں نم آنکھیں تشکر سے بھری ہوئی زمین کی طرف تک رہی تھیں۔

کملا اسے دیکھ کر سکتے میں آ گیا۔ وہ اس ارادے سے آیا تھا کہ اسے کسی طرح سے یہاں سے ٹال دوں۔ میکے چلے جانے کی تحریک کروں۔ اسے اس کی ذرا بھی پرواہ نہ تھی کہ آیندہ اس بے کس کا کیا حشر ہوگا۔ اس کی گذر بسر کیسے ہوگی۔ اس کی حفاظت کون کرے گا۔ وہ اس وقت اپنے یہاں سے ٹال کر اپنے سر کا بوجھ ہٹا دینا چاہتا تھا لیکن اس بیوہ کی بھولی بھالی معصوم صورت دیکھ کر اس تنگدلی پر غیرت آئی۔ کون آدمی ایسا سنگ دل ہے جو کسی گل نازک کو توڑ کر بھاڑ میں جھونک دے۔ زندگی میں پہلی بار اس کا دل حسن سے متاثر ہوا۔ اندھیرے گھر میں چراغ جل اٹھا۔ ''تمھیں اب یہاں اکیلے رہنے میں بڑی تکلیف ہوگی، ادھر پریما بھی اکیلی گھبرایا کرتی ہے، اگر تم بھی جا کر اس کے ساتھ رہو تو کیا ہرج ہے۔''

پورنا سر نیچا کیے ایک لمحہ تک سوچنے کے بعد بولی ''ہرج کیا ہے یہاں بھی تو آپ ہی لوگوں کے بھروسے پر پڑی ہوں؟''

کملا- ''تو آج چلی چلو، بابو جی کی بھی یہی خواہش ہے، میں جا کر آدمیوں کو اسباب لے جانے کے لیے بھیجے دیتا ہوں۔''

پورنا- ''نہیں بابو جی، اتنی جلدی نہ کیجیے۔ سوچ لینے دیجیے۔''

کملا- ''اس میں سوچنے کی کون سی بات ہے۔ یہاں اکیلی کیسے پڑی رہوگی؟''

پورنا- ''اکیلی تو نہیں ہوں۔ مہری بھی یہیں سونے کو کہتی ہے۔''

کملا- اچھا! وہ بلّو، ہاں بڑھیا ہے تو سیدھی مگر ٹرّی ہے۔ آخر میرے گھر چلنے میں تمھیں کیا پس وپیش ہے۔

پورنا- ''کچھ نہیں۔ پس وپیش کیا ہے۔''

کملا- ''تو آدمیوں کو جا کر بھیج دوں؟''

پورنا- بھیج دیجیے گا ابھی جلدی کیا ہے؟

کملا- ''تم ناحق اتنا سوچا کرتی ہو، پورنا! کیا تم سمجھتی ہو کہ تمھارا جانا میرے گھر کے اور لوگوں کو برا معلوم ہوگا؟''

کملا کا قیاس درست نکلا۔ پورنا کو واقعی یہی اعتراض تھا۔ مگر وہ لحاظ کے سبب اسے ظاہر نہ کر سکتی تھی۔ اس نے سمجھا بابو جی نے میرے دل کی بات تاڑ لی۔ اس سے وہ نادم ہوئی۔ بابو صاحب کے گھر والوں کے متعلق ایسا خیال اسے نہ ہونا چاہیے تھا۔ مگر

© NCERT not to be republished

کملا پرشاد نے اس کے پس وپیش کا خاتمہ کردیا۔ بولے۔ ’’تمھارا یہ خیال بالکل قدرتی ہے پورنا۔ مگر سوچو، میرے مکان میں ایسا کون سا آدمی ہے جو تمھاری مخالفت کرسکے۔ بابو جی کی خود ہی یہ خواہش ہے۔ مجھے تم خود ہی جانتی ہو۔ پنڈت بسنت کمار سے میری کتنی گہری دوستی تھی۔ یہ تم سے پوشیدہ نہیں۔ پریما تمھاری سہیلی ہی ہے۔ بابو جی کو تم سے کتنی محبت ہے، تم یہ جانتی ہو، رہ گئی سومترا اسے ذرا برا لگے گا۔ تم سے کوئی پردا نہیں مگر اس کی پرواہ کون کرتا ہے۔ اسے خوش رکھنے کا بھی تمھیں ایک گر بتائے دیتا ہوں۔ کبھی کبھی یہ منتر پڑھ دیا کرنا۔ وہ تمھاری برائی نہ کرے گی۔ بس اس کی خوبصورتی کی تعریف کردینا۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ تعریف کرنے سے وہ سمجھ جائے گی کہ یہ مجھے بنا رہی ہے۔ تم چاہے جتنا سراہو، وہ اسے ٹھیک ہی سمجھے گی۔ اسی منتر سے میں اسے نچایا کرتا ہوں۔ وہی منتر تمھیں بتائے دیتا ہوں۔‘‘

پورنا کو ہنسی آگئی بولی ’’آپ تو ان کی ہنسی اڑا رہے ہیں۔ بھلا ایسا کون ہوگا جسے اتنی سمجھ نہ ہو۔‘‘

کملا- اتنی سمجھ کو تم معمولی بات سمجھ رہی ہو۔ تم کو یہ سن کر تعجب ہوگا۔ مگر اپنی تعریف سن کر ہم اتنے متوالے ہوجاتے ہیں کہ پھر ہم میں اچھا برا سمجھنے کی تمیز ہی نہیں رہ جاتی۔ بڑے سے بڑا مہاتما بھی اپنی تعریف سن کر خوشی سے پھول اٹھتا ہے۔ ہاں تعریف کرنے والے کے لفظوں میں بھگتی (عقیدت) کی جھلک ہونا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شعرا کو جھوٹی تعریفوں کے پل باندھنے کے لیے راجے مہاراجے انعام واکرام کیوں دیتے۔ بتاؤ راجا صاحب طمنچہ کی آواز سن کر چونک پڑتے ہیں۔ کانوں میں انگلی ڈال لیتے ہیں اور گھر میں بھاگتے ہیں۔ مگر دربار کا شاعر شجاعت میں ارجن اور درونا چار یہ سے دو ہاتھ اور اونچا اٹھا دیتا ہے تو راجا صاحب کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ انھیں مطلق یہ خیال نہیں ہوتا کہ میرا مضحکہ اڑایا جارہا ہے۔ ایسی تعریفوں میں ہم الفاظ کو نہیں، ان کے چھپے ہوئے جذبات کو دیکھتے ہیں۔ سمترا رنگ روپ میں اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتی۔ اسے نہ جانے یہ خبط کیسے ہوگیا۔ یہ کہتے ہوئے بہت رنج ہوتا ہے۔ مگر ایسی عورت کے ہاتھوں میری زندگی خراب ہوگئی۔ مجھے معلوم ہی نہیں ہوا کہ محبت کسے کہتے ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ بدنصیب آدمی ہوں۔ شاید پچھلے جنم کے گناہوں کا پرائشچت کررہا ہوں۔ سمترا سے بولنے کو جی نہیں کرتا لیکن منہ سے کچھ نہیں کہتا کہ گھر میں کہرام نہ مچ جائے۔ لوگ سمجھتے ہیں میں آوارہ ہوں۔ تفریح کے لیے سنیما اور تھیٹر جاتا ہوں لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں پورنا میں ان تماشوں میں محض اپنے درد دل کو بہلانے کے لیے جاتا ہوں۔ اپنی گرسنہ آرزوؤں کو اور کیسے سمجھاؤں۔ دل کی آگ کو کیسے بجھاؤں۔ کبھی کبھی جی میں آتا ہے کہ سنیاسی ہوجاؤں اور شاید، ایک دن مجھے ...... یہی کرنا پڑے گا۔ تم سمجھتی ہوگی یہ حضرت کہاں کا جھگڑا لے بیٹھے۔ معاف کرنا۔ نہ جانے میں آج کیوں تم سے یہ تذکرہ کرنے لگا۔ آج تک میں نے ان خیالات کو کبھی ظاہر نہیں کیا تھا۔ حسرت نصیب دل ہی سے ہمدردی کی امید ہوتی ہے۔ بس یہ سمجھ لو، تو میں جا کر آدمیوں کو بھیجے دیتا ہوں۔ تمھارا اسباب

© NCERT not to be republished

اٹھالے جائیں۔ پورنا کو اب کیا عذر ہوسکتا تھا۔ اس کا جی اب بھی گھر چھوڑنے کو نہ چاہتا تھا لیکن اب وہ اس تحریک کو نہ ٹال سکی۔ اسے یہ خوف بھی ہوا کہ میرے انکار سے ان کو ملال نہ ہو۔ اس بے کس کے لیے اس وقت تنکے کا سہارا بھی بہت تھا، تو بھلا اس کشتی کو کیسے حقیر سمجھتی۔ لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ وہ اسے پار لے جانے والی کشتی نہیں بلکہ ایک خوفناک دریائی جانور ہے جو اس کی روح کو نگل جائے گا۔

(5)

پورنا کو اپنے گھر سے نکلتے وقت بہت رنج ہونے لگا۔ اس نے اپنی بامسرت زندگی کے تین سال اسی گھر میں کاٹے تھے۔ یہیں سہاگ کے سکھ دیکھے۔ یہیں رنڈاپے کے دکھ بھی دیکھے۔ اس گھر کو چھوڑتے اس کا دل پھٹتا جاتا تھا۔ جس وقت چاروں کہار اس کا اسباب اٹھانے کے لیے گھر میں آئے تو یکا یک رو پڑی۔ اس کے دل میں کچھ ایسے جذبات پیدا ہوگئے جیسے نعش کے اٹھاتے وقت سوگ کرنے والوں کے دل میں پیدا ہوجاتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ نعش گھر میں نہیں رہ سکتی اور جتنی جلدی اس کا کفن دفن ہوجائے اتنا ہی اچھا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے اس کی محبت کے جوش میں آکر اس کے پانو سے لپٹ جاتے ہیں اور پابوسی سے پاگل ہوکر ہلا دینے والی آواز میں رو پڑتے ہیں۔ یہ گمان باطل کہ شاید لاش میں زندگی کے کچھ آثار باقی ہوں، ایک پردہ کی طرح آنکھوں کے سامنے سے دور ہوجاتا ہے اور دنیاوی محبت کا آخری رشتہ شکست ہوجاتا ہے۔ اسی طرح پورنا بھی مکان کے ایک گوشہ میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ اپنے پیارے سوامی کی یادگار کا یہ سہارا بھی رنج کے بحر بے کراں میں غائب ہوگیا۔ اس مکان کا ایک ایک گوشہ اس کے لیے دل کش یادگاروں سے مملو تھا، سہاگ کے سورج کے غروب ہوجانے پر بھی یہاں اس کی کچھ چمک نظر آتی تھی۔ سہاگ کے سہانے گیت کے ختم ہوجانے پر بھی یہاں اس کی گونج اٹھ رہی تھی۔ اس مکان میں ادھرادھر چلتے ہوئے اسے اپنے سہاگ کا دکھ بھرا گھمنڈ محسوس ہوتا رہتا تھا۔ آج اس سورج کی آخری چمک مٹی جارہی تھی۔ آج اس گیت کی وہ گونج ایک غیرمحدود خلا میں ڈوبی جاتی تھی۔ آج گھمنڈ دل کو چیر کر نکلا جارہا تھا۔

پڑوس کی عورتوں کو جب معلوم ہوا کہ پورنا یہاں سے جارہی ہے تو سب اسے رخصت کرنے آئیں۔ پورنا کے اخلاق وانکسار نے سبھی کے قلوب کو مسخر کرلیا تھا۔ پورنا کے پاس دولت نہ تھی مگر میٹھی باتیں تھیں۔ بشاش چہرہ تھا۔ ہمدردی تھی۔ خدمت گزاری تھی جو دولت کی بہ نسبت کہیں زیادہ قیمتی جواہر ہیں اور جن کی ضرورت لوگوں کو دولت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ پورنا ان سبھوں سے گلے مل کر رخصت ہوئی، گویا لڑکی سسرال جاتی ہو۔ شام کے وقت وہ اپنی مہری بلو کے ساتھ روتی ہوئی اس طرح چلی گویا کوئی جلاوطن ہو۔ پیچھے مڑ مڑ کر اپنے پیارے گھر کو دیکھتی جاتی تھی۔ گویا اس کا دل وہیں رہ گیا ہو۔

© NCERT not to be republished

پریما اپنے دروازے پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ پورنا کو دیکھتے ہی دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ گئی۔ اس گھر میں پورنا عموماً روز ہی آیا کرتی تھی۔ یہاں آتے ہی اس کا دل خوش ہوجاتا تھا۔ ہنسی کھیل میں وقت کٹ جاتا تھا مگر آج اس گھر میں قدم رکھنے میں پس وپیش ہو رہا تھا۔ شاید وہ پچھتا رہی تھی کہ ناحق ہی آئی۔ پریما کے گلے مل کر بھی اس کا دل خوش نہ ہوا تب وہ سہیلی کی حیثیت سے آتی تھی۔ آج وہ ان کی دست نگر بن کر آئی تھی۔ تب اس کا آنا معمولی بات تھی۔ اس کی کوئی خاص آؤ بھگت نہ ہوتی تھی۔ لوگ اس کی پیشوائی کے لیے نہ دوڑتے تھے۔ آج اس کے آتے ہی دیوکی مودی خانہ کا دروازہ کھلا چھوڑ کر نکل آئی۔ سمترا اپنے بال گتھا رہی تھی۔ آدھی گتھی ہوئی چوٹی پر آنچل ڈال کر بھاگی۔ مہریاں اپنے اپنے کام چھوڑ کر نکل آئیں۔ کملا پرشاد پہلے ہی آنگن میں کھڑے تھے۔ لالہ بدری پرشاد سندھیا کرنے جارہے تھے۔ اسے ملتوی کر کے آنگن میں آپہنچے۔ یہ خاطر داریاں دیکھ کر پورنا کا دل بیٹھا جارہا تھا۔ اس دل جوئی کا باعث اعزاز نہیں رحم تھا۔

دیوکی کو سمترا کی کوئی بات نہ بھائی تھی۔ اس کا ہنسنا، بولنا، چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، پہننا، اوڑھنا، سبھی انھیں پھوہڑ پن کی انتہائی حد سے تجاوز کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور وہ ہمیشہ اس کی سخت تنقید کرتی رہتی تھیں۔ ان کی تنقیدوں میں محبت اور بزرگانہ نصیحت کا رنگ تھا یا منافرت کا، اس کا فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ سمترا تو اسے منافرت ہی سمجھتی تھی اس لیے وہ انھیں اور بھی چڑھاتی رہتی تھی۔ دیوکی سویرے اٹھنے کی تاکید کرتی تھی۔ سمترا پہروں دن چڑھے اٹھتی۔ دیوکی گھونگھٹ نکالنے کو کہتی تھی۔ سمترا اس کے جواب میں آدھا سر کھلا رکھتی تھی۔ دیوکی مہریوں سے احتراز کرنے کی تعلیم دیتی تھی، سمترا مہریوں سے ہنسی دل لگی کرتی رہتی تھی۔ دیوکی کو پورنا کا یہاں آنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ سمترا اسے بھانپ گئی۔ پہلے ہی سے اس نے شوہر کی اس تجویز پر ناک سکیڑی تھی۔ یہ جان کر کہ یہ تجویز پوری ہوکر رہے گی، اس نے اس سے اختلاف کر کے اچھس (اپ یش) لینا مناسب نہ سمجھا تھا۔ وہ ساس کے دل کا رنگ سمجھ رہی تھی۔ یہ بھی جانتی تھی کہ پورنا بھی سمجھ رہی ہے۔ اس لیے پورنا سے اسے محبت اور ہمدردی پیدا ہوگئی۔ اب تک دیوکی پورنا کو دکھا کر سمترا کو شرمندہ کرنا چاہتی تھی اس لیے سمترا پورنا سے جلتی تھی۔ آج دیوکی پورنا سے بے اعتنائی کر رہی تھی اس لیے سمترا کا اس سے بہناپا ہوجانا لازم ہوگیا۔

پورنا آج بھی بہت دیر تک پریما کے پاس نہ بیٹھی۔ دل بہت اداس تھا۔ آج اسے اپنی حالت کا اندازہ ہوا تھا۔ اتنی جلدی اس کی حالت کیا سے کیا ہوگئی تھی۔ یہ آج اس کی سمجھ میں آرہا تھا۔ یہ گھر اس کے کھپریل والے گھر سے کہیں زیادہ آرام دہ تھا۔ اس کے کمرے میں فرش تھا، چارپائی تھی، الماریاں تھیں، برقی روشنی تھی، پنکھا تھا، مگر اس وقت بجلی کی روشنی اس کی آنکھوں میں چبھ رہی تھی اور پنکھے کی ہوا شعلہ کی طرح جسم کو جھلسائے ڈالتی تھی۔ پریما کے بہت اصرار کرنے پر بھی وہ آج کچھ نہ کھا سکی۔ تقدیر اس کے ساتھ کیسا کھیل کھیل رہی تھی۔ اس کے سرتاج کو اس کے ہاتھ سے چھین کر اب اس کو کھلونے سے خوش کرنا چاہتی تھی۔ اس کی دونوں

© NCERT not to be republished

آنکھیں پھوڑ کر اسے سہانے منظر کی سیر کرا رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ کاٹ کر جل بہار کرنے کے لیے اتھاہ سمندر میں ڈھکیل رہی تھی۔

گیارہ بج گئے تھے۔ پورنا روشنی سے آنکھیں ہٹا کر تاریکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس گہری تاریکی میں اسے کتنے خوش نما منظر نظر آ رہے تھے۔ وہی اپنا کھپریل کا مکان تھا۔ وہی پرانی چارپائی تھی۔ وہی چھوٹا سا صحن تھا اور اس کے شوہر دفتر سے آ کر اس کی طرف ہنستے ہوئے اور محبت بھری نگاہوں سے تاکتے ہوئے جیب سے کوئی چیز نکال کر دکھاتے اور چھپا لیتے تھے۔ وہ بیٹھی ہوئی پان لگا رہی تھی۔ جھپٹ کر اٹھی اور شوہر کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولی ''دکھا دو کیا ہے؟'' شوہر نے مٹھی بند کر لی، اس کی دلچسپی اور بڑھی۔ اس نے خوب زور لگا کر مٹھی کھولی۔ مگر اس میں کچھ نہ تھا، آہ، آج اس کھیل، اس چھیڑ چھاڑ میں اسے اپنی زندگی کی تفسیر چھپی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

دفعتاً سمترا نے آ کر پوچھا ''ارے تم وہاں کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو۔ میں نے سمجھا تھا تمھیں نیند آ گئی ہوگی۔''

پورنا نے آنسو پونچھ ڈالے اور سنبھل کر کہا ''یہ تو تم جھوٹ کہتی ہو بہن۔ یہ سوچتیں تو تم آتیں کیوں؟''

سمترا نے پلنگ پر بیٹھے ہوئے کہا ''سوچا تو یہی تھا سچ کہتی ہوں، مگر نہ جانے کیوں چلی آئی۔ شاید تمھیں سوتا دیکھ کر لوٹ جانے ہی کے لیے آئی تھی، سچ کہتی ہوں۔ اب لیٹو نا رات تو بہت ہوگئی۔''

پورنا نے کچھ متفکر ہو کر پوچھا ''اب تک تم کیسے جاگ رہی ہو؟''

سمترا – تمام دن سویا جو کرتی ہوں۔

پورنا – تو کیوں سوتی ہو تمام دن؟

سمترا – یہی رات کو جاگنے کے لیے۔

سمترا ہنسنے لگی، ایک لمحہ میں یکا یک اس کا چہرہ سنجیدہ ہوگیا۔ بولی ''اپنے ماں باپ کی زر پرستی کا پرائشچت کر رہی ہوں بہن اور کیا'' یہ کہتے کہتے وہ آبدیدہ ہوگئی۔

پورنا یہ سن کر متحیر ہوگئی۔ اس کی زندگی کے نغمۂ شیریں میں یہ کرخت آواز کیوں؟

سمترا کسی اندرونی تکلیف سے بے قرار ہو کر بولی ''تم دیکھ لینا بہن! ایک روز یہ محل ڈھہ جائے گا۔ یہ بد دعا میرے منہ سے بار بار نکلتی ہے۔''

پورنا نے تعجب سے کہا ''ایسا کیوں کہتی ہو بہن'' پھر اسے ایک بات یاد آ گئی، پوچھا'' کیا ابھی بھیا جی نہیں آئے۔''

سمترا دروازے کی طرف خوف زدہ نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

© NCERT not to be republished

''ابھی نہیں، بارہ ہی تو بجے ہیں، اتنی جلدی کیوں آئیں گے؟ نہ ایک، نہ دو، نہ تین۔ میرا بیاہ تو اس محل سے ہوا ہے۔ لالہ بدری پرشاد کی بہو ہوں۔ اس سے زیادہ سُکھ کا خیال کون کرسکتا ہے؟ بھگوان نے کس لیے مجھے جنم دیا، سمجھ میں نہیں آتا۔ اس گھر میں میرا کوئی اپنا نہیں ہے بہن! میں زبردستی پڑی ہوئی ہوں۔ میرے مرنے جینے کی کسی کو پرواہ نہیں ہے۔ تم سے یہی التجا ہے کہ مجھ پر رحم کرنا۔ ٹوٹے ہوئے تاروں سے میٹھے سُر نہیں نکلتے تھے۔ تم سے نہ جانے کیا کیا کہوں گی۔ کسی سے کہہ نہ دینا، نہیں تو اور مصیبت میں پھنس جاؤں گی۔ ہم دونوں دکھیا ہیں۔ تمھارے دل میں میٹھی یادیں ہیں، میرے دل میں وہ بھی نہیں۔ میں نے سکھ دیکھا ہی نہیں، اور نہ دیکھنے کی امید ہی رکھتی ہوں۔''

پورنا نے ایک لمبی سانس کھینچ کر کہا ''میری تقدیر سے اپنی تقدیر کا مقابلہ نہ کرو بہن، دست نگری سے بڑی مصیبت بدنصیبی کے خزانے میں بھی نہیں ہے۔''

سمترا سوکھی ہنسی ہنس کر بولی۔ ''وہ مصیبت کیا میرے سر نہیں ہے بہن! اگر مجھے کہیں ٹھکانا ہوتا، اس گھر میں لمحہ بھر بھی نہ رہتی۔ سینکڑوں بار والدین کو لکھ چکی ہوں کہ مجھے بلالو میں عمر بھر تمھاری خدمت کرتی رہوں گی۔ مگر انھوں نے بھی میری طرف سے اپنا دل سخت کرلیا ہے۔ جواب میں نصیحتوں کا ایک دفتر آجاتا ہے، جسے میں کبھی نہیں پڑھتی۔ اس گھر میں صرف میرے سسر ہیں جنھیں ایشور نے دل دیا ہے۔ اور سب کے سب پتھر کے دیوتا ہیں۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں بہن! مجھے اس کا رنج نہیں ہے کہ یہ حضرت کیوں اتنی رات گئے گھر کو آتے ہیں یا ان کا دل کسی اور سے اٹکا ہوا ہے۔ اگر آج مجھے یہ معلوم ہوجائے کہ کسی محبت میں گرفتار ہوگئے ہیں تو میری آدھی تکلیف مٹ جائے۔ میں موسلوں سے ڈھول بجاؤں۔ مجھے تو یہ رونا ہے کہ ان کے دل ہی نہیں بلکہ دل کی جگہ خودغرضی کا ایک روڑا رکھا ہوا ہے۔ نہ کتابوں سے دلچسپی، نہ گانے سے نہ کھیل سے۔ دلچسپی ہے صرف پیسے سے! مجھے تو یقین نہیں کہ انھیں سنیما میں مزہ آتا ہوگا، وہاں بھی کوئی نہ کوئی غرض ہے لین دین، سوائے ڈیوڑھے، گھاٹے، نفع میں ان کی جان بسی رہتی ہے اور مجھے ان باتوں سے نفرت ہے۔ کمرے میں آتے ہیں تو پہلی بات جو ان کے منہ سے نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ بتی ابھی تک کیوں نہیں بجھائی۔ وہ دیکھو سواری آگئی۔ اب گھنٹے دو گھنٹے کفایت کی نصیحت سننی پڑے گی۔ یوں میں روپے کو ہیچ نہیں سمجھتی۔ جمع کرنا اچھی بات ہے مگر یہ کیا، کہ آدمی روپے کا غلام ہوجائے۔ صرف انھیں چڑھانے کے لیے کچھ نہ کچھ فضول خرچی کیا کرتی ہوں۔ مزا تو یہ ہے کہ انھیں اپنے ہی پیسوں کی ماکھ نہیں ہوتی، میں اپنے پاس سے کچھ خرچ نہیں کرسکتی! پتا جی (والد صاحب) مہینے میں چالیس پچاس روپے بھیج دیتے ہیں۔ ورنہ اس گھر کی کانی کوڑی نہ ملے۔ میری جو خواہش ہوتی ہے، کرتی ہوں۔ سو وہ بھی آپ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس پر بھی کئی بار جھگڑا ہوچکا ہے۔ سونے لگنا تو بتی بجھا دینا۔ بہن جاتی ہوں۔''

سمترا چلی گئی۔ پورنا نے بتی بجھادی اور لیٹی۔ مگر نیند کہاں؟ آج ہی اس مکان میں قدم رکھا تھا اور آج ہی اس کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہورہا تھا۔ یہ یقینی تھا کہ وہ بہت دن یہاں نہ رہے گی۔

(6)

لالہ بدری پرشاد کے لیے امرت رائے سے اب کوئی واسطہ رکھنا غیر ممکن تھا۔ شادی تو دوسری بات تھی، سماج میں اتنی زبردست بداخلاقی کا موید بن کر امرت رائے نے خود کو ان کی نظروں سے گرادیا تھا۔ ان سے اب کسی قسم کا تعلق پیدا کرنا بدری پرشاد کے لیے ذلت کی بات تھی۔ امرت رائے کے بعد دان ناتھ سے بہتر شخص انھیں کوئی اور نظر نہ پڑا۔ زیادہ پرسش وجستجو کرنے کا اب موقع بھی نہ تھا۔ امرت رائے کے انتظار میں پہلے ہی بہت دیر ہوچکی تھی۔ برادری میں لوگ انگشت نمائی کرنے لگے تھے۔ نئے شخص کی جستجو میں شادی کے ایک غیر معین وقت تک ٹل جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے دل کو ادھر ادھر نہ دوڑا کر انھوں نے دان ناتھ ہی کے ساتھ عقد پختہ کرنے کا تہیہ کرلیا، دیوکی نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ پریما نے اس معاملہ میں لاپرواہی ظاہر کی۔ اب اس کے لیے سبھی مرد برابر تھے اور ہر کسی کے ساتھ زندگی کا نباہ کرسکتی تھی۔ اس کی چلتی تو وہ دوشیزہ ہی رہنا پسند کرتی۔ مگر جوان لڑکی بیٹھی رہے یہ خاندان کے لیے بدنامی کی بات تھی۔ اس معاملے میں وہ کسی قسم کی بے جا ضد کرکے والدین کا دل نہ دکھانا چاہتی تھی۔

جس دن امرت رائے نے وہ زبردست عہد کیا۔ اسی دن پریما نے سمجھ لیا کہ اب زندگی میں میرے لیے سکھ کا خاتمہ ہوگیا مگر بن بیاہ رہ کر اپنا مضحکہ کرانے کی بہ نسبت کسی کی ہوکر رہنا کہیں زیادہ بہتر تھا۔ آج سے دوتین برس قبل دان ناتھ ہی سے اس کے بیاہ کی بات چیت ہورہی تھی۔ اسے وہ جانتی ہی تھی۔ درمیان میں حالات تبدیل نہ ہوگئے ہوتے تو آج وہ دان ناتھ کے گھر میں ہوتی۔ دان ناتھ کو وہ کئی بار دیکھ بھی چکی تھی۔ اس میں محبت ہے، شرافت ہے، علمیت ہے، یہ باتیں اسے معلوم تھیں، ان کی نیک چلنی پر بھی کسی کو شبہہ نہ تھا۔ وہ دیکھنے میں بھی بہت سجے گٹھے آدمی تھے۔ برہمچریہ (تجرّد) کی رونق چہرے پر نمایاں تھی۔ انھیں اس سے محبت تھی۔ یہ راز پریما سے مخفی نہ تھا۔ آنکھیں دل کے راز کو آشکار کرہی دیتی ہیں۔ امرت رائے نے مذاق ہی مذاق میں پریما سے اس کا تذکرہ بھی کردیا تھا۔ یہ سب ہوتے ہوئے بھی پریما کو ان کا اگر کچھ خیال تھا تو وہ اتنا ہی کہ وہ امرت رائے کے دلی دوست ہیں۔ ان میں بڑی محبت ہے۔ وہ دولت مند نہیں تھے مگر یہ کوئی عیب نہ تھا، کیوں کہ پریما شوقین نہ تھی۔ کیوں اس کا دل امرت رائے کی طرف رجوع ہوتا تھا۔ اس کا کوئی خاص سبب اس کو نہ معلوم تھا۔ مگر ایسی حالت میں اس کے لیے کوئی اور تدبیر نہ تھی۔ اب تک اس نے دان ناتھ کو کبھی اس نگاہ سے نہ دیکھا تھا۔ مگر اب دل میں وہ جگہ خالی ہوجانے کے بعد دان ناتھ کو اس میں بٹھانے میں اسے

تکلیف نہ ہوئی۔ اس نے دل کوٹٹول کر دیکھا تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دان ناتھ سے محبت بھی کر سکتی ہے۔ بدری پرشاد شادی کے معاملے میں اس کی رضامندی ضروری سمجھتے تھے۔ پریما تیار تھی۔ اس لیے دان ناتھ کے پاس پیغام بھیج دیا۔

دان ناتھ اب بڑے شش و پنج میں پڑے۔ یہ پیغام پاتے ہی انھیں خوشی سے پھول اٹھنا چاہیے تھا۔ مگر یہ بات نہ ہوئی۔ انھیں اپنی منظوری لکھ بھیجنے میں ایک ہفتہ سے زائد لگ گیا۔ طرح طرح کے اندیشے ہوتے تھے۔ وہ پریما کو خوش رکھ سکیں گے؟ اس کے دل پر قابو پا سکیں گے؟ ایسا نہ ہو کہ زندگی وبال ہوجائے؟ ان کا دل ان سوالات کا بہت ہی تشفی بخش جواب دیتا تھا۔ محبت میں اگر دل کو کھینچنے کی طاقت ہے تو وہ ضرور کامیاب ہوں گے لیکن اخلاقی اعتبار سے انھیں اپنا طرزِ عمل دوستی ہی کے خلاف نہیں، شرافت کے خلاف بھی معلوم ہوتا تھا۔ اپنی جان سے زیادہ پیارے دوست کی بےنفسی سے فائدہ اٹھانے کا خیال انھیں پریشان کر دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس کا گھر جل رہا ہے اور وہ تاپ رہے ہیں۔ انھیں یقین تھا کہ پریما سے جتنی محبت مجھے ہے، اتنی امرت رائے کو نہیں ہے۔ اس کے بغیر انھیں اپنی زندگی خشک معلوم ہوتی تھی۔ ان کا میلان متاہل زندگی کی جانب تھا۔ خدمت کے جذبات ان کی فطرت میں نہ تھے۔ نام و نمود کی تمنا بھی نہ تھی۔ ایثار کا ذکر تو بہت دور کی بات تھی۔

بالآخر بہت غور و خوض کے بعد انھوں نے طے کیا ''ایک بار امرت رائے کو پھر ٹٹولنا چاہیے۔ اگر اب بھی وہ ان کی رائے تبدیل کر سکے تو عین خوشی کی بات ہوگی۔ زندگی کی مسرت تو تمنا میں ہے۔ بالفرض یہ خواہش پوری ہوئی تو کوئی دوسری آ کھڑی ہوگی۔ جب ایک نہ ایک خواہش کا موجود رہنا یقینی ہے تو یہی کیوں نہ رہے، اس سے اور مسرت انگیز دوسری کونسی خواہش ہوسکتی ہے؟ اس کے سوا یہ اندیشہ بھی تو تھا کہ کہیں زندگی کا یہ ناٹک فراقیہ نہ ثابت ہو۔ پہلی محبت کتنی لافانی ہوتی ہے اسے وہ خوب جانتے تھے۔

آج کل کالج تو بند تھا مگر دان ناتھ ''ڈاکٹر'' کے لقب کے لیے ایک نئی کتاب لکھ رہے تھے۔ کھانا کھا کر کالج چلے جاتے تھے۔ یہاں کتب خانے میں بیٹھ کر جتنی آسانیاں تھیں وہ مکان پر نہ ہوسکتی تھیں۔ آج وہ تمام دن کتب خانے میں بیٹھے رہے مگر نہ تو ایک حرف لکھا اور نہ ایک سطر پڑھی۔ انھوں نے مشکل کام کر ڈالنے کا آج تہیہ کرلیا تھا جسے وہ کئی روز سے ٹالتے آرہے تھے۔ کیا کیا باتیں ہوں گی، دل میں یہی سوچتے ہوئے وہ امرت رائے کے بنگلے پر جا پہنچے۔ آفتاب پھولوں اور پتیوں پر اپنی آخری برکت کی زریں بارش کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ٹم ٹم تیار کھڑی تھی مگر امرت رائے کا پتا نہ تھا۔ نوکر سے پوچھا تو معلوم ہوا کمرے میں ہیں۔ کمرے کے دروازے کا پردہ اٹھاتے ہی بولے ''بھلے آدمی، تمھیں گرمی بھی نہیں لگتی، یہاں سانس لینی مشکل ہے اور بیٹھے ہوئے تپسیا کر رہے ہیں۔''

روشنی کی ایک باریک شعاع چق کے اندر جاتی ہوئی امرت رائے کے چہرے پر پڑی۔ دان ناتھ چونک پڑے، وہ چہرہ زرد

ہو رہا تھا، آٹھ دس روز قبل جو رونق تھی اس کا کہیں نام ونشان تک نہ تھا۔ گھبرا کر کہا ''یہ تمھاری کیا حالت ہے؟ کہیں لؤ تو نہیں لگ گئی؟ کیسی طبیعت ہے؟''

امرت رائے نے دان ناتھ کو گلے لگاتے ہوئے کہا ''ایسا بھی کبھی ہوا ہے کہ تم نے مجھے دیکھ کر یہ کہا ہو، آج کل تم خوب تندرست ہو۔ تمھیں تو میں ہمیشہ ہی بیمار نظر آتا ہوں۔ ہر مرتبہ پیشتر سے زیادہ۔ جیتا کیسے ہوں، یہ ایشور ہی جانے مگر ذرا اپنی صورت تو دیکھو۔ دنیا بھر کے اصولوں کو چاٹے بیٹھے ہو مگر اتنا نہیں ہوسکتا کہ شام کو سیر ہی کر لیا کرو۔''

دان ناتھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس ٹم ٹم ہوتی تو سارا دن دوڑتا۔ گھوڑا بھی یاد کرتا کہ کسی سے پالا پڑا تھا۔ پیادہ پا تو مجھے گھومنے میں لطف نہیں آتا۔ تمھیں دنیا میں بڑے بڑے کام کرنے ہیں۔ جسم کی حفاظت کرو۔ تمھی نے دنیا کی نجات کا ٹھیکہ لیا ہے۔ یہاں کیا ایک روز چپکے سے دنیا سے چل دینا ہے۔ چاہتا تو میں بھی ہوں کہ باقاعدہ زندگی بسر کروں مگر جب نبھ جاوے تب تو۔ کتنی بار ڈنڈ، مگدر، ڈمبل شروع کیا، مگر کیا کبھی نباہ سکا؟ آخر سمجھ گیا تندرستی میرے لیے ہے ہی نہیں، پھر اس کے لیے کیوں مفت حیران ہوں؟ اتنا جانتا ہوں کہ دائم المریض لوگوں کی عمریں طویل ہوتی ہیں۔ تم ایک بار ملیریا کے موسم میں مر کے جیتے ہو۔ تمھیں بخار آتا ہے۔ سیدھا 106 درجہ تک جا پہنچتا ہے۔ مجھے ایک تو بخار آتا ہی نہیں، اور آیا بھی تو 101 درجے سے آگے بڑھنے کی ہمت ہی نہیں کرتا۔ دیکھ لینا تم مجھ سے پہلے رخصت ہوگے۔ حالاں کہ میری دلی تمنا یہی ہے کہ تمھاری گود میں میری جان نکلے۔ اگر تمھارے سامنے مروں تو میری یادگار ضرور قائم کرنا۔ تمھاری یادگار قائم کرنے والے تو بہت نکل آئیں گے مگر میری دوڑ تو تمھیں تک ہے! میری عظمت سے اور کون واقف ہے۔''

ان شرارت آمیز الفاظ میں مذاق کے ساتھ کتنا لگاؤ، کتنی زبردست محبت بھری ہوئی تھی کہ دونوں ہی دوستوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دان ناتھ مسکرا پڑے۔ مگر امرت رائے کا چہرہ متین ہو گیا۔ دان ناتھ ہنس مکھ تھے مگر مذاق کا طرز سوزِ باطن کا پتا دے رہا تھا۔ امرت رائے نے پوچھا۔ ''لال بدری پرشاد کے یہاں سے کوئی پیغام آیا؟ تم ادھر کئی روز سے دکھائی نہیں دیے۔ میں سمجھ گیا کہ وہاں اپنا رنگ جما رہے ہوگے اس لیے گیا بھی نہیں۔''

امرت رائے نے اس معاملے کو چھیڑ کر دان ناتھ پر بڑا احسان کیا۔ ورنہ وہ یہاں گھنٹوں غپ شپ کرتے رہنے پر بھی وہ بات زبان پر نہ لا سکے۔ اب بھی ان کے بشرے سے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ تذکرہ فضول چھڑ گیا۔ بڑے تامّل کے ساتھ بولے۔ ''ہاں پیغام تو آیا ہے، مگر میں نے جواب دے دیا۔''

امرت رائے نے گھبرا کر پوچھا ''کیا جواب دے دیا؟''

دان ناتھ – ''جو میرے جی میں آیا۔''

امرت – ''آخر سنوں تو تمھارے جی میں کیا آیا؟''

دان ناتھ – ''یہی کہ مجھے منظور نہیں۔''

امرت – ''یہ کیوں بھئی، کیا پریما تمھارے قابل نہیں؟''

دان ناتھ–''نہیں یہ بات نہیں۔ میں خود اس کے قابل نہیں ہوں۔''

امرت رائے نے تیز لہجہ میں کہا۔''اس کے قابل نہیں ہو تو اتنے دنوں سے اس کے لیے تپسیا کیوں کر رہے ہو؟ میں درمیان میں نہ آپڑتا تو اس میں بھی کیا کوئی شبہہ ہے کہ اس سے تمھارا عقد ہوگیا ہوتا؟ میں نے دیکھا کہ تم اس غم میں اپنی زندگی برباد کیے ڈالتے ہو۔ تم نے کتنے ہی پیغام لوٹا دیے، حتیٰ کہ مجھے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ میں تمھارے راستے سے ہٹ جاؤں۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ اس کی جدائی میں گھلتے گھلتے کہیں تم ایک دن مجھے تنہا چھوڑ کر چلتا دھندا نہ کرو۔ میں نے اپنے دل کو ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ میں اس صدمے کو برداشت کر سکتا ہوں، مگر تم نہیں برداشت کر سکتے۔ بھلے آدمی! تمھارے لیے تو میں نے اپنے دل پر اتنا بڑا جبر کیا اور اب تم کاوے کاٹ رہے ہو۔ اب اگر تم نے ذرا بھی چون و چرا کی تو میں مار ہی ڈالوں گا۔ سمجھ لینا۔ چپکے سے میری ٹمٹم پر بیٹھو اور لالہ بدری پرشاد کے پاس جا کر معاملہ طے کر آؤ۔''

دان ناتھ نے برقی بٹن دباتے ہوئے کہا۔''تم اس کام کو جتنا آسان سمجھتے ہو اتنا آسان نہیں ہے، کم از کم میرے لیے۔''

امرت رائے نے دوست کے چہرے کو محبت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔''میں یہ جانتا ہوں، بیشک آسان نہیں ہے۔ میں ہی رکاوٹ ڈالنے والا تھا۔ میں اب بھی ہوں لیکن تم جانتے ہو کہ میں نے ایک بار جو بات ٹھان لی۔ اب برہما بھی اتر آئیں تو مجھے منحرف نہیں کر سکتے۔ پنڈت امرناتھ کا کہنا میرے دل نشیں ہوگیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریما ہی نہیں کسی بھی دوشیزہ سے شادی کرنے کا حق مجھے نہیں ہے۔ ایشور نے وہ حق مجھ سے چھین لیا۔ پریما جیسی بیش بہا جنس کو پا کر چھوڑ دینے کا مجھے کتنا رنج ہو رہا ہے، یہ میں ہی جانتا ہوں اور کچھ کچھ تم بھی جانتے ہو۔ مگر اس رنج میں خواہ میری جان ہی جاتی رہے جس کا کوئی امکان نہیں ہے، تو بھی اپنی اس زندگی میں پریما کو داخل نہ رہنے دوں گا۔ اب تم میری طرف سے مطمئن ہوگئے؟''

دان ناتھ اب بھی مطمئن نہ ہوئے تھے۔ ان کے دل میں ایک نہیں سیکڑوں رکاوٹیں پیدا ہو رہی تھیں۔ یہ سمجھ کر کہ یہ نئی بات سن کر امرت رائے ہنس نہ پڑیں وہ خود ہنس کر بولے۔''مجھ جیسے چھچھورے کو پریما قبول کرے گی، یہ بھی خیال آیا ہے آنجناب کو؟''

امرت رائے نے زور سے قہقہہ لگایا۔''بھئی واہ کیا بات سوچی ہے، مانتا ہوں! ارے احمق داس، جب لالہ بدری پرشاد نے

© NCERT not to be republished

تمھارے یہاں پیغام بھیجا تو سمجھ لو کہ انھوں نے پریما سے دریافت کرلیا ہے۔ ایسا کیے بغیر وہ کبھی پیغام نہ بھیجتے۔لڑکی کو اعلیٰ تعلیم دینے کا کفّارہ تو انھیں ادا کرنا ہی پڑتا ہے۔ چند باتوں میں تو وہ ہم لوگوں سے بھی زیادہ فراخ دل ہیں، اور چند باتوں میں جہلا سے بھی پست تر۔ پردے سے انھیں چڑ ہے ، یہ جانتے ہی ہو۔ بدھوا ِ اہ (بیاہ) ان کی آنکھوں میں بدترین اخلاقی گناہ ہے۔تمھارا یہ اندیشہ تو بے بنیاد ثابت ہوا۔ ہاں یہ اندیشہ ہوسکتا ہے کہ پریما کو تم سے محبت نہ ہو۔مگر ایسا خیال کرنا پریما کے ساتھ سخت ناانصافی کرنا ہے۔ وہ خاندانی رواج پر مٹنے والی سچی دیوی ہے۔ اس کی محبت کے معنیٰ ہی ہیں ’’شوہر پرستی‘‘۔محبت کی کسی دوسری صورت سے وہ واقف ہی نہیں اور نہ شاید واقف ہوگی۔ مجھ سے اس کو اس لیے محبت تھی کہ وہ مجھے اپنا ہونے والا شوہر خیال کرتی تھی۔ پس اس کی محبت اس فرض شناسی پر محمول ہے۔ایسے فضول اندیشوں میں مفت دن گزار رہے ہو۔سہا لگ نکل جائے گا تو پھر ایک سال امیدواری کرنی پڑے گی۔‘‘

دان ناتھ فکر میں ڈوب گئے۔ اگر چہ ان کے اعتراضوں کی تردید ہوچکی تھی، مگر اب بھی ان کے دل میں ایسی متعدد باتیں تھیں جنھیں وہ ظاہر نہ کرسکتے تھے۔شک دلیل سے دور ہوجانے پر بھی بالکل مٹ نہیں جاتا۔ دوست سے بے وفائی کا خیال ان کے دل میں کچھ اس قدر چھپ کر بیٹھا ہوا تھا کہ اس پر کوئی حربہ کارگر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

دفعتاً امرت رائے نے گھنٹی بجائی۔ ایک بوڑھا آدمی سامنے آ کر کھڑا ہوگیا۔ امرت رائے نے بدری پرشاد کے نام ایک خط لکھا اور دان ناتھ سے بولے۔’’اس پر دستخط کرو۔‘‘

دان ناتھ دریچہ کے سامنے کھڑے سگار پی رہے تھے۔ پوچھا۔

’’کیسا خط؟‘‘

امرت – ’’پڑھ لو سامنے تو ہے۔‘‘

دان – ’’تم میری گردن پر چھری چلا رہے ہو۔‘‘

امرت – ’’بس چپکے سے دستخط کردو۔ مجھے ایک جلسہ میں جانا ہے۔ دیر ہو رہی ہے۔‘‘

دان – ’’تو گولی ہی کیوں نہ ماردو کہ ہمیشہ کا جھنجھٹ مٹ جائے۔‘‘

امرت – ’’بس اب چیں چپڑ نہ کرو ورنہ یاد رکھو، پھر تمھاری صورت نہ دیکھوں گا۔ یہ دھمکی اپنا کام کرگئی۔ دان ناتھ نے خط پر دستخط کردیے اور تب بگڑ کر بولے۔’’دیکھ لینا، میں آج سنکھیا کھا لیتا ہوں کہ نہیں، یہ خط دھرا ہی رہ جائے گا۔سویرے ’’رام نام ست‘‘ ہوگا۔‘‘

امرت رائے نے خط ایک لفافے میں بند کرکے بوڑھے کو دیا۔ بدری پرشاد کا نام سنتے ہی بوڑھا مسکرایا اور خط لے کر

© NCERT not to be republished

چلا گیا۔

تب امرت رائے نے ہنس کر کہا۔'' سنکھیا نہ ہوتو میں دیدوں گا۔ ایک بار کسی دوا میں ڈالنے کے لیے منگوائی تھی۔''

دان ناتھ نے بگڑ کر کہا۔'' میں تمھارا سرتوڑ دوں گا، تم ہمیشہ سے مجھ پر حکومت کرتے آئے ہو اور اب بھی کرنا چاہتے ہو لیکن اب مجھ پر تمھارا کوئی داؤں نہ چلے گا۔آخر میں بھی تو کوئی چیز ہوں۔''

امرت رائے اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے۔

(7)

لالہ بدری پرشاد کو دان ناتھ کا خط کیا ملا۔ صدمے کے ساتھ ہی ذلت بھی ملی۔ وہ امرت رائے کی تحریر پہچانتے تھے۔ اس کی ساری عاجزی اور التجا اس تحریر میں گم ہوگئی۔ غصہ سے ان کا دماغ گرم ہوگیا۔ دان ناتھ کے کیا ہاتھ ٹوٹ گئے تھے، جو اس نے امرت رائے سے یہ خط لکھایا ؟ کیا اس کے پیروں میں مہندی لگی تھی جو یہاں تک نہ آسکتا تھا اور یہ امرت رائے بھی کتنا بے حیا ہے ! وہ ایسا خط کس طرح لکھ سکا۔ ذرا بھی شرم نہ آئی۔

اب تک لالہ بدری پرشاد کو کچھ کچھ امید تھی کہ شاید امرت رائے کا جوش میں کیا ہوا عہد کچھ مدھم پڑ جائے۔تحریر دیکھ کر پہلے وہ یہی سمجھے تھے کہ امرت رائے نے معافی مانگی ہوگی لیکن خط پڑھا تو امید کا وہ باریک رشتہ بھی منقطع ہوگیا۔ دان ناتھ کا خط پا کر شاید وہ امرت رائے کو بلا کر دکھاتے اور ان کے جذباتِ حسد کو مشتعل کر کے اپنے پنجے میں لانے کی کوشش کرتے۔ اس امید کی بھی دھجیاں اڑ گئیں۔ اس نے جلے پر نمک چھڑک دیا۔ امرت رائے کی تحریر دیکھ کر غصّے سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے انھوں نے دان ناتھ کو یہ خط لکھا۔

'' لالہ دان ناتھ جی! آپ نے امرت رائے سے یہ خط لکھا کر میری اور پریما کی جتنی توہین کی ہے، اس کا آپ مطلق اندازہ نہیں کر سکتے۔ مناسب تو یہی تھا کہ میں اسے پھاڑ کر پھینک دیتا اور آپ کو کوئی جواب نہ دیتا لیکن ......''

یہیں تک لکھنے پائے تھے کہ دیوکی نے آ کر بڑے شوق سے پوچھا۔'' کیا لکھا ہے امرت رائے نے؟''

بدری پرشاد نے کاغذ کی طرف سر جھکائے ہوئے کہا۔'' ان کا کوئی خط نہیں آیا۔''

دیوکی - '' چلو کوئی خط کیوں نہیں آیا۔ میں نے کوٹھے پر دیکھا، ان کا آدمی ایک خط لیے لپکا آرہا تھا۔''

بدری - '' ہاں آدمی تو ان ہی کا تھا مگر خط تھا دان ناتھ کا! اُسی کا جواب لکھ رہا ہوں۔ حضرت نے امرت رائے سے لکھوایا

ہے اور نیچے اپنے دستخط کر دیے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے لکھتے شرم آتی تھی۔ بے ہودہ، شہدہ۔''

دیوکی – ''خط میں تھا کیا؟''

بدری – ''یہ پڑا ہے۔ پڑھ کیوں نہیں لیتیں۔''

دیوکی نے خط پڑھ کر کہا۔ ''تو اس میں اتنا بگڑنے کی کون سی بات ہے؟ ذرا دیکھوں سرکار نے اس کا کیا جواب لکھا ہے؟''

بدری – لو دیکھو، ابھی تو شروع کیا ہے۔ ایسی خبر لوں گا کہ بچہ سارا شہدہ پن بھول جائے گا۔

دیوکی نے بدری پرشاد کا خط پڑھا اور پھاڑ کر پھینک دیا۔

بدری پرشاد نے کڑک کر پوچھا ''پھاڑ کیوں ڈالا؟ تم کون ہوتی ہو میرا خط پھاڑنے والی؟''

دیوکی – تم کون ہوتے ہو ایسا خط لکھنے والے؟ امرت رائے کو کھو کر کیا ابھی بھر نہیں پایا۔ جواب دانو کو بھی کھو دینے کی فکر کرنے لگے۔ تمھارے خط کا نتیجہ یہی ہوگا کہ دانو پھر تمھیں اپنی صورت کبھی نہ دکھائے گا۔ زندگی تو میری لڑکی کی خراب ہوگی، تمھارا کیا بگڑے گا؟

بدری – ''ہاں اور کیا۔ لڑکی تو تمھاری ہے، میری تو کوئی ہوئی نہیں۔''

دیوکی – ''آپ کی کوئی ہوتی تو اسے کنویں میں ڈھکیلنے کو یوں تیار نہ ہو جاتے۔ یہاں دوسرا کون لڑکا ہے پریما کے لائق، ذرا سنوں۔''

بدری – ''دنیا لائق لڑکوں سے خالی نہیں ہے، ایک سے ایک بڑھ کر پڑے ہوئے ہیں۔''

دیوکی – ''پاس کے دو تین شہروں میں تو کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ ہاں باہر کی میں نہیں کہتی، ستّو باندھ کر کھوجنے نکلو گے تو معلوم ہوگا۔ برسوں دوڑتے گزر جائیں گے، پھر بھی بے جانے پہچانے گھر میں لڑکی کون بیاہے گا اور پریما کیوں ماننے لگی۔''

بدری – ''اس نے اپنے ہاتھ سے کیوں خط نہیں لکھا۔ میرا تو یہ کہنا ہے کہ کیا اسے اتنا بھی نہیں معلوم کہ اس سے میری کتنی توہین ہوئی۔ سارے امتحانات تو پاس کیے بیٹھا ہے، ڈاکٹر بھی ہونے جا رہا ہے۔ کیا اسے اتنا بھی نہیں معلوم۔ صاف بات ہے کہ دونوں مل کر میری توہین کرنا چاہتے ہیں۔''

دیوکی – ''ہاں شہدے تو ہیں ہی، تمھاری توہین کرنے کے سوا اور ان کا کام ہی کیا ہے؟ صاف بات تو ہے اور تمھاری سمجھ میں نہیں آتی۔ نہ جانے عقل تقسیم ہوتے وقت تم کہاں چلے گئے تھے؟ پچاس کے ہوئے اور اتنی موٹی سی بات نہیں سمجھ سکتے۔''

بدری پرشاد نے ہنس کر کہا۔ ''میں تمھیں کھوجنے گیا تھا۔''

© NCERT not to be republished

دیوکی ادھیڑ ہونے پر بھی خوش مذاق تھی، بولی ’’واہ میں پہلے ہی پہنچ کر کئی حصے اڑا لے گئی۔ دونوں میں کتنی دوستی ہے، یہ تو جانتے ہی ہو۔ دان ناتھ لحاظ سے خود نہ لکھ سکا ہوگا۔ امرت بابو نے سوچا ہوگا، کہ لالہ جی کوئی اور لڑکا نہ ٹھیک کرنے لگیں۔ اس لیے یہ خط دانو سے جبراً دستخط کرا لیے ہوں گے۔‘‘

بدری پرشاد نے خفّت سے کہا۔ ’’اتنا تو میں بھی سمجھتا ہوں، کیا ایسا گنوار ہوں۔‘‘

دیوکی۔ ’’تب کس لیے اتنا جامہ سے باہر ہو رہے تھے؟ بلا کر کہہ دو منظور ہے۔ بیچاری بوڑھی ماں کے بھاگ کھل جائیں گے۔ مجھے تو اس پر ترس آتا ہے۔‘‘

بدری۔ ’’مجھے اب یہ افسوس ہو رہا ہے کہ پہلے ہی دانو سے کیوں نہ بیاہ کر دیا، اتنے دنوں تک کیوں امرت رائے کا منہ تاکتا رہا، آخر وہی کرنا پڑا۔‘‘

دیوکی۔ ’’تقدیر کو کون جانتا تھا اور حق تو یہ ہے کہ دانو نے پریما کے لیے تپسیا بھی بہت کی۔ چاہتا تو اب تک کبھی کی اس کی شادی ہوگئی ہوتی۔ کہاں سے پیغام نہیں آئے۔ رشتہ داروں نے کتنا سمجھایا مگر اس نے کبھی ہاں نہ کی۔ پریما اس کے دل میں بسی ہوئی ہے۔‘‘

بدری۔ ’’لیکن پریما اسے قبول کرے گی۔ پہلے یہ تجویز کرلو۔ ایسا نہ ہو کہ میں یہاں منظور کرلوں اور پریما انکار کردے۔ اس بارے میں اس کی منظوری لے لینی چاہیے۔‘‘

دیوکی۔ ’’پھر تم مجھے چڑھانے لگے۔ دانو میں کون سی برائی ہے جو وہ انکار کرے گی۔ لاکھوں میں ایک لڑکا ہے، ہاں یہ ضد ہو کہ کروں گی تو امرت رائے سے کروں گی ورنہ بے بیاہی رہوں گی، تو جنم بھر ان کے نام پر بیٹھی رہے۔ امرت رائے تو اب کسی بدھوا ہی سے بیاہ کرے گا۔ ممکن ہے بیاہ ہی نہ کرے، اس کا دید ہی دوسرا ہے۔ میری بات مانو۔ دانو کو خط لکھ دو۔ پریما سے پوچھنے جانچنے کا کام نہیں۔ دل ایسی چیز نہیں جو قابو میں نہ آ جائے۔ میرا دل تو اپنے پڑوس کے وکیل صاحب سے کرنے کا تھا۔ انھیں کوٹ پتلون پہنے بگھی پر کچہری جاتے دیکھ کر میں خوش ہو جاتی تھی۔ مگر تمھارے نصیب جاگے، ماں باپ نے تمھارے پلّے باندھ دیا— تو میں نے کیا کیا۔ دو ایک دن تو ضرور رنج ہوا مگر پھر ان کی طرف خیال بھی نہ گیا۔ تم شکل وصورت، عقل وتمیز، دولت وثروت، کسی بات میں ان کی برابری نہ کر سکتے تھے مگر قسم لو جو میں نے شادی کے بعد کبھی بھولے سے ان کی یاد کی ہو۔‘‘

بدری۔ ’’اچھا جبھی تم بار بار مائیکے جایا کرتی تھیں!‘‘

دیوکی۔ ’’مجھے چھیڑو گے تو میں کچھ کہہ بیٹھوں گی۔‘‘

بدری - ''تم نے اپنی بات کہہ ڈالی تو میں بھی کہے دیتا ہوں۔ میری بھی ایک عیسائی لڑکی سے محبت ہوگئی تھی۔ میں عیسائی ہونے والا تھا۔ رنگ روپ میں پری تھی۔ تم اس کے پیروں کی خاک کو بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ مجھے اب تک اس کی یاد ستاتی ہے۔''

دیوکی - ''جھوٹے کہیں کے! جب میں آئی تو مہینہ بھر تک تو تم مجھ سے بولتے شرماتے تھے۔ عیسائی عورت سے محبت کرتے تھے! وہ تو تمھیں بازار میں بیچ آتی! اور پھر تم لوگوں کی بات میں نہیں چلاتی، سچ بھی ہوسکتی ہے۔''

بدری - ''ذرا پریما کو بلالو پوچھ لینا ہی اچھا ہے۔''

دیوکی-''(جھنجھلا کر) اس سے کیا پوچھوگے، اور وہ کیا کہے گی۔ یہی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ مجھ سے جب اس بارے میں باتیں ہوتی ہیں وہ یہی کہتی رہی ہے کہ میں کنواری رہوں گی، وہی پھر کہے گی۔ مگر اتنا میں جانتی ہوں کہ جس کے ساتھ تم بات چیت پکّی کروگے اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اتنا وہ جانتی ہے کہ گرہست لڑکی کنواری نہیں رہ سکتی۔''

بدری - ''رو رو کر جان تو نہ دے گی؟''

دیوکی - ''نہیں میں ایسا نہیں سمجھتی! فرض کا اسے بڑا خیال رہتا ہے اور یوں تو پھر دکھ ہی ہے جسے دل میں اپنا سوامی سمجھ چکی تھی، اسے دل سے نکال کر پھینک دینا کوئی سہل کام ہے؟ یہ زخم کہیں برسوں میں بھرے گا۔ اس سال وہ بیاہ کرنے پر راضی نہ ہوگی۔''

بدری- ''اچھا میں ابھی آیا۔ پورنا سے پوچھوں—ان پڑھی لکھی لڑکیوں کا مزاج کچھ اور ہی ہوجاتا ہے۔ اگر فرض اور محبت میں مخالفت ہوگئی تو ان کی ساری زندگی ہی رنج میں گذرتی ہے وہ محبت اور فرض پر ایثار کرنا نہیں جانتیں یا نہیں چاہتیں۔ ہاں محبت اور فرض میں میل ہوجائے تو ان کی زندگی اعلیٰ زندگی ہوجاتی ہے۔ ایسا ہی مزاج پریما کا معلوم ہوتا ہے۔ میں دانو کو لکھے دیتا ہوں کہ مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔ مگر پریما سے پوچھ کر ہی تصفیہ کرسکوں گا۔''

دفعتاً کملا پرشاد آکر بولے۔ ''آپ نے کچھ سنا ہے؟ بابو امرت رائے تو ایک بدھوا آشرم کھولنے جارہے ہیں۔ کمانے کا یہ ڈھنگ نکالا ہے۔''

بدری پرشاد نے ذرا چیں بہ جبیں ہوکر پوچھا۔ ''کمانے کا یہ ڈھنگ کیسا؟ میں نہیں سمجھا۔''

کملا - ''وہی جو اور لیڈر کرتے ہیں۔ آشرم میں بیواؤں کی پرورش و پرواخت کی جائے گی، انھیں تعلیم بھی دی جائے گی۔ چندے کی رقمیں آئیں گی اور یار لوگ مزے کریں گے۔ کون جانتا ہے، کہاں سے کتنے روپے آئے، پھر مہینے بھر میں ایک جھوٹا سچا حساب چھپوا دیا۔ سنا ہے کئی رؤسا نے بڑے بڑے چندے دینے کا وعدہ کیا ہے۔ پانچ لاکھ کا تخمینہ ہے۔ اس میں کم از کم پچاس ہزار تو یاروں کے ہیں! وکالت میں اتنے روپے اتنی جلدی کہاں ملے جاتے تھے؟''

بدری – ''پچاس ہزار ہی بنائے تو کیا بنائے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ایک لاکھ سے کم پر ہاتھ صاف نہ کریں گے۔''

کملا – ''ان لوگوں کو سوجھتی خوب ہے، ایسی باتیں ہم لوگوں کو نہیں سو ـــتـــ ـے۔''

بدری – ''جا کر دونوں ان کی شاگردی کرو۔ اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔''

کملا – ''تو کیا میں کچھ کہتا ہوں۔''

بدری – ''ذرا بھی نہیں، تم کبھی جھوٹ بولے ہی نہیں۔ بھلا آج کیوں جھوٹ بولنے لگے۔ سچائی کے اوتار تمھیں تو ہو۔''

دیوکی – ''سچ کہا ہے کہ ہَوَن کرتے ہاتھ جلتے ہیں۔ وہ بے چارا تو اُپکار کے لیے اپنا سب کچھ ہَوَن کیے بیٹھا ہے اور تمھاری نگاہوں میں اس نے دنیا والوں کو ٹھگنے کے لیے ایک سوانگ رچا ہے! آپ تو کچھ نہیں کر سکتے۔ دوسروں کے بھلے کاموں میں رکاوٹ ڈالنے کو تیار! انھیں ایشور نے کیا نہیں دیا ہے جو یہ ڈھونگ رچتے؟''

کملا – ''اچھا میں ہی جھوٹا سہی۔ اس میں جھگڑا کا ہے کا؟ تھوڑے دنوں میں آپ ہی قلعی کھل جائے گی۔ آپ جیسے سیدھے سادے لوگ دنیا میں نہ ہوتے تو ایسے مکّاروں کی تھیلیاں کون بھرتا؟''

دیوکی – ''بس چپ بھی رہو۔ ایسی باتیں تمھیں منہ سے نکالتے شرم نہیں آتی۔ کہیں پریما کے سامنے ایسی بے سر پیر کی باتیں نہ کرنے لگنا۔ یاد ہے کہ تم نے ایک بار امرت رائے کو جھوٹا کہا تھا تو اس نے تین دن تک کھانا نہیں کھایا تھا۔''

کملا – ''یہاں ان باتوں سے نہیں ڈرتے، خوشامد کی باتیں کرنا مجھے نہیں آتا۔ کہوں گا سچ ہی، چاہے کسی کو بھلا لگے یا برا۔ وہ ہماری توہین کرتے ہیں تو ہم ان کی پوجا نہ کریں گے۔ آخر وہ ہمارے کون ہوتے ہیں جو ہم ان کے کرتوتوں پر پردہ ڈالیں؟ میں انھیں اتنا بدنام کروں گا کہ سارے شہر میں کسی کو منہ نہ دکھا سکیں گے۔''

یہ کہتا ہوا کملا چلا گیا۔ اسی وقت پریما نے کمرے میں قدم رکھا۔ اس کی پلکیں نم تھیں۔ گویا ابھی روتی رہی ہو۔ اس کا نازک جسم ایسا لاغر ہو گیا تھا گویا کسی نغمہ کی آوازِ بازگشت ہو۔ چہرہ کسی ہجراں نصیب کی یادِ ماضی کی طرح نحیف اور اداس تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ''دادا جی'' آپ ذرا بابو دان ناتھ کو بلا کر سمجھا دیں کہ وہ کیوں جیجا پر جھوٹا الزام لگاتے پھرتے ہیں۔''

بدری پرشاد نے متحیر ہو کر کہا۔ ''دان ناتھ! وہ بھلا کیوں امرت رائے پر حملہ کرنے لگے۔ ان میں جیسی دوستی ہے ویسی تو میں نے اور کہیں دیکھی ہی نہیں۔'' پریما۔ ''یقین تو مجھے بھی نہیں آتا مگر بھیا جی یہی کہہ رہے ہیں۔ بدھوا آشرم کھولنے کا جیجا جی کا بہت دنوں سے ارادہ تھا۔ کئی بار مجھ سے اس کے متعلق گفتگو ہو چکی ہے لیکن بابو دان ناتھ اب یہ کہتے پھرتے ہیں کہ وہ اس چندہ سے روپیہ جمع کر کے زمینداری خریدنا چاہتے ہیں۔''

© NCERT not to be republished

بدری - ''کملا کہتے تھے؟''

پریما - ''ہاں بھیاجی کہتے تھے۔ دان ناتھ نے ان سے کہا ہوتو تعجب ہی کیا ہے۔''

بدری - ''کملا جھوٹ بول رہا ہے، سراسر جھوٹ، دانو کو میں خوب جانتا ہوں اس کا سا شریف آدمی میں نے بہت کم دیکھا ہے۔ مجھے تو یقین ہے کہ آج امرت رائے کے نفع کے لیے جان دینے کا موقع آجائے تو دانو شوق سے اپنی جان قربان کردے گا۔ آدمی کیا ہیرا ہے۔ مجھ سے جب ملتا ہے بڑی عاجزی سے پیر چھو لیتا ہے۔''

دیوکی - ''کتنا ہنس مکھ ہے، میں نے اسے جب دیکھا ہنستے ہی دیکھا۔ بالکل بچوں کا مزاج ہے۔ اس کی ماں رویا کرتی ہے کہ میں مرجاؤں گی تو دانو کو کون کھلا پلا کر سلائے گا؟ دن بھر بھوکا بیٹھا رہے گا۔ مگر کھانا نہ مانگے گا اور اگر کوئی بلا بلا کر کھلائے تو تمام دن کھاتا ہی رہے گا۔ بڑی سادہ طبیعت کا ہے۔ غرور تو چھو بھی نہیں گیا۔''

بدری - ''اب کے ڈاکٹر ہو جائے گا۔''

لالہ بدری پرشاد ان آدمیوں میں تھے جو دُبدھے میں نہیں رہنا چاہتے۔ کسی نہ کسی فیصلہ پر پہنچ جانا ان کے دلی اطمینان کے لیے ضروری تھا۔ دان ناتھ کے خط کا تذکرہ کرنے کا ایسا نادر موقعہ پا کر وہ ضبط نہ کر سکے۔ بولے۔ ''یہ دیکھو! پریما: دانو نے ابھی ابھی یہ خط بھیجا ہے۔ میں تم سے مشورہ کرنے جا ہی رہا تھا کہ تم خود ہی یہاں آگئیں۔''

خط کا مطلب کیا ہے، پریما اسے فوراً تاڑ گئی۔ اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خط لے لیا۔ مگر تحریر دیکھی تو صاف امرت رائے کی ہے۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

تحریر دیکھ کر ایک دن اس کا دل کتنا خوش ہو جاتا تھا۔ آج وہی تحریر اس کی آنکھوں میں کانٹا بن کر چبھنے لگی۔ ایک ایک لفظ بچھو کی طرح اس کے دل پر ڈنک مارنے لگا۔ اس نے خط لے کر دیکھا۔ وہی تحریر تھی۔ وہی اس کی جانی بوجھی خوشنما صاف تحریر، جو دلی اطمینان کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کا مطلب وہی تھا جو پریما نے سمجھا تھا۔ وہ اس کے لیے پہلے ہی سے تیار تھی۔ اسے یقین تھا کہ دان ناتھ اس موقع پر نہ چوکیں گے۔ اس نے خط کا جواب پہلے ہی سے سوچ رکھا تھا، شکریہ کے ساتھ، صاف انکار مگر یہ امرت رائے کے قلم سے نکلے گا، جس کا امکان ہی اس کے وہم وگمان سے باہر تھا۔ امرت رائے اتنے بے درد ہیں، اس کا اسے خیال بھی نہ ہوسکتا تھا۔ وہی دل جو امرت رائے کے ساتھ مصیبت کے سخت ترین صدمے اور آفتوں کی ناقابل برداشت تکلیفیں سہنے کو تیار تھا، آج اس بے اعتنائی کی ٹھیس نہ سہہ سکا۔ وہ بے مثال محبت، وہ غیر محدود عقیدت جو پریما نے ان میں برسوں سے مرکوز کر رکھی تھی، ایک آہِ سرد کے ساتھ جاتی رہی۔ اسے معلوم ہوا گویا اس کے سارے اعضا سست پڑ گئے ہیں۔ گویا دل بھی ساکت ہو گیا ہے۔ گویا اس کی اپنی

زبان پر بھی بالکل قابو نہیں ہے۔ اس کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکل پڑے۔’’ آپ کی جو مرضی ہو کیجیے، مجھے سب منظور ہے۔‘‘ وہ کہنے جا رہی تھی، جب کنوئیں میں گرنا ہی ہے تو جیسے کچا ویسے پکا، اس میں کوئی فرق نہیں، مگر جیسے اس کو کسی نے خبردار کر دیا۔ وہ فوراً خط کو وہیں پھینک کر اپنے کمرہ میں لوٹ آئی اور دریچے کے سامنے کھڑی ہو کر زار و قطار رونے لگی۔

شام ہو گئی تھی، آسمان میں ایک ایک کر کے تارے نکلتے آتے تھے۔ پریما کے دل میں اسی طرح ایک ایک کر کے یادداشتیں آنے لگیں۔ دیکھتے دیکھتے سارا آسمان تاروں سے جگمگا اٹھا۔ پریما کا دل بھی یادداشتوں سے بندھ گیا۔ مگر ان بے شمار تاروں سے آسمان کی تاریکی کیا اور بھی گہری نہیں ہو گئی تھی۔

بیساکھ میں پریما کی شادی دان ناتھ کے ساتھ ہو گئی۔ بڑی دھوم دھام رہی۔ کُل شہر کے رؤسا کو مدعو کیا گیا۔ لالہ بدری پرشاد نے دونوں ہاتھوں سے دولت لٹائی۔ مگر دان ناتھ کی طرف سے کوئی تیاری نہ تھی۔ امرت رائے چندہ کی فراہمی کے لیے بہار کی طرف چلے گئے تھے اور تاکید کر گئے تھے،’’ دھوم دھام مت کرنا۔‘‘ دان ناتھ ان کی مرضی کے خلاف کیسے چلتے۔

ادھر پورنا کے آنے سے سومترا کو گویا آنکھیں مل گئیں۔ اس کے ساتھ باتیں کرنے سے سومترا کو سیری نہ ہوتی۔ آدھی رات تک اپنا دکھڑا سنایا کرتی۔ زندگی میں اس کا کوئی ساتھی نہ تھا۔ شوہر کی بے رخی روز ہی اس کے دل میں چبھا کرتی تھی، اس بے رخی کا سبب کیا ہے، یہ مسئلہ اس سے حل نہ ہوتا تھا۔ وہ بہت خوبصورت نہ تھی، پھر بھی اسے کوئی بدصورت نہ کہہ سکتا تھا۔ بناؤ سنگھار کا تو اسے مرض سا ہو گیا تھا۔ شوہر کے دل لبھانے کے لیے وہ نت نیا سنگھار کرتی تھی اور مقصد برآری نہ ہونے سے اس کے دل میں آگ سی جلتی تھی! گھی کے چھینٹوں سے بھڑکنا تو آگ کے لیے قدرتی تھا۔ وہ پانی کے چھینٹوں سے بھی بھڑکتی تھی! کملا پرشاد جب اسے اپنی محبت جتاتے تو اس کے دل میں آتا کہ سینے میں چھری مارلوں — زخموں میں یونہی کیا کم درد ہوتا ہے کہ کوئی اس پر نمک چھڑکے؟ آج سے تین برس پہلے سومترا نے کملا کو پا کر اپنے کو دھنیہ مانا تھا۔ دو تین مہینے اس کے سکھ سے کٹے، مگر جوں جوں ہر دو طبائع کا تضاد آشکارا ہونے لگا، دونوں ایک دوسرے سے کھنچنے لگے۔ سومترا فیاض تھی، کملا اعلیٰ درجہ کا ممسک! وہ پیسہ کو ٹھیکری سمجھتی تھی، کملا کوڑیوں کو دانت سے پکڑتا تھا۔ سومترا عموماً فقیروں کو بھیک دینے جاتی تو اتنا دیتی کہ وہ ’’چٹکی‘‘ کی انتہائی حد سے تجاوز کر جاتا تھا۔ اس کے مائیکے سے ایک مرتبہ برہمنی کوئی خوش خبری لے آئی تھی، اسے اٹھا کر نئی ریشمی ساڑھی دے دی۔ ادھر کملا کا یہ حال تھا کہ فقیر کی آواز سنتے ہی گرج اٹھتے تھے۔ رول اٹھا کر مارنے دوڑتے تھے۔ دو چار کو پیٹ بھی دیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ دروازہ پر جا کر کسی فقیر کی اگر کملا پرشاد کی مڈبھیڑ ہو گئی تو اسے دوسری مرتبہ وہاں جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ سومترا میں انکسار اور رحم تھا۔ کملا میں گھمنڈ، چھچھورا پن اور خودغرضی۔ ایک آسمان پر کا جاندار تھا اور دوسرا زمین پر رینگنے والا، ان میں میل کیسے ہو؟

دان ناتھ نے آ کر کہا۔ ’’کملا!‘‘

پورنا کی آمد سے کملا اور سومترا ایک دوسرے سے اور بھی علاحدہ ہوگئے۔ سومترا کے دل کا بوجھ ہلکا سا ہوگیا۔ یہاں تو وہ دن کا دن بے پروائی سے پلنگ پر پڑے رہنے میں گذار دیتی، کہاں اب وہ ہر وقت ہنستی بولتی رہتی، کملا کی اس نے پرواہی کرنا چھوڑ دی۔ وہ کب گھر میں آتا ہے اور کب جاتا ہے۔ کب کھاتا ہے اور سوتا ہے۔ ان باتوں کی اسے ذرا بھی فکر نہ رہی۔ کملا پرشاد بدقماش نہ تھا۔ سب کا یہی خیال تھا کہ اس میں خواہ کتنے ہی عیوب ہوں مگر عیاشی کا عیب نہ تھا۔ کسی عورت پر تاک جھانک کرتے اسے کسی نے نہ دیکھا تھا۔ پھر پورنا کے حسن نے اسے کس طرح گرویدہ کرلیا، یہ راز کون سمجھ سکتا ہے؟ شاید پورنا کی سادگی، عاجزی اور بےکسی نے کملا کی نفسیاتی خواہشوں کو متحرک کر دیا۔ اس کی کنجوسی اور بزدلی ہی اس کے اخلاق کی بنیاد تھی۔ عیاشی گراں چیز ہے۔ جیب کے روپے خرچ کر کے بھی کسی آفت میں مبتلا ہوجانے کا جہاں ہرلحہ امکان ہو، ایسے کام میں کملا پرشاد جیسا ہوشیار آدمی نہ پڑسکتا تھا۔ پورنا کے بارے میں اسے کوئی تردّد نہ تھا وہ اتنی سیدھی سادی تھی کہ اسے قابو میں لانے کے لیے کسی بڑی ریاضت کی ضرورت نہ تھی۔ اور پھر یہاں تو نہ کسی کا خوف تھا نہ پھنسنے کا اندیشہ اور نہ مار کھانے کا خیال۔ پورنا کی بےکسی نے ان تمام اندیشوں کو غیر مسلّح بنا دیا تھا۔ اس نے سمجھا تھا کہ اب اس کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔ صرف گھر والوں کی آنکھ بچالینا کافی ہوگا اور یہ بات کچھ مشکل نہ تھی مگر یہاں بھی ایک رکاوٹ پیدا ہوگئی اور وہ سومترا تھی! سومترا پورنا کو ایک لحہ کے لیے بھی نہ چھوڑتی تھی۔ دونوں کھانا کھانے ساتھ جاتیں۔ چھت پر دیکھو تو ساتھ۔ کمرے میں دیکھو تو ساتھ، رات کو ساتھ، دن کو بھی دونوں ساتھ ہی ساتھ سوجاتیں۔ کملا جب خواب گاہ میں جا کر سومترا کا انتظار کرتا کرتا سوجاتا تو نہ جانے کب وہ اس کے پاس آجاتی۔ پورنا سے تنہائی میں کوئی بات کرنے کا اسے موقع نہ ملتا تھا۔ وہ دل میں سومترا پر جھنجھلا کر رہ جاتا۔ آخر ایک روز اس سے ضبط نہ ہوسکا۔ رات کو جب سومترا آئی تو اس نے کہا:

’’تم رات دن پورنا کے پاس کیوں بیٹھی رہتی ہو؟ وہ اپنے دل میں سمجھتی ہوگی کہ یہ تو اچھی بلا گلے پڑی۔ ایسی تو بڑی سمجھدار بھی نہیں ہو کہ تمھاری باتوں میں اسے مزا آتا ہو، تمھاری بےوقوفی پر ہنستی ہوگی۔‘‘

سومترا نے کہا۔ ’’اکیلی پڑی پڑی کیا کروں؟ یہ بھی تو اچھا نہیں لگتا کہ میں آرام سے سوؤں اور وہ اکیلی رویا کرے، اٹھنا بھی چاہتی ہوں تو وہ لپٹ جاتی ہے۔ چھوڑتی ہی نہیں، دل میں میری بےوقوفی پر ہنستی ہے یا نہیں، یہ کون جانے؟ مگر میرا ساتھ اسے اچھا نہ لگتا ہو، یہ بات نہیں۔‘‘

کملا۔ ’’تمھیں یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ اس کی اور تمھاری کوئی برابری نہیں۔ وہ تمھاری سہیلی بننے کے قابل نہیں ہے۔‘‘

سومترا۔’’میں ایسا نہیں سمجھتی۔‘‘

کملا ۔’’تمھیں اتنی سمجھ ہی نہیں۔ سمجھو گی کیا؟‘‘

سومترا۔’’ایسی سمجھ کا نہ ہونا ہی اچھا ہے۔‘‘

اس روز سے سومترا سائے کی طرح پورنا کے ساتھ رہنے لگی۔

کملا پرشاد کے طریقوں میں اب ایک عجیب تبدیلی سی ہوتی جاتی تھی۔ سنیما دیکھنے کا اب اسے شوق نہ تھا۔ نوکروں پر ڈانٹ پھٹکار بھی کم ہوگئی۔ کچھ فراخ دست بھی ہوگیا۔ ایک روز بازار سے بنگلہ مٹھائی لایا۔ سومترا کو دیتے ہوئے کہا۔’’ذرا اپنی سکھی کو چکھانا‘‘ سومترا نے مٹھائی لے لی مگر پورنا سے اس کا ذکر نہ کیا۔ دوسرے روز کملا نے پوچھا۔’’پورنا نے مٹھائی پسند کی ہوگی۔؟‘‘ سومترا نے جواب دیا۔ بالکل نہیں۔ وہ کہتی تھیں کہ مجھے مٹھائی سے کبھی رغبت نہیں رہی۔‘‘

کئی روز کے بعد ایک روز کملا پرشاد دو ریشمی ساڑھیاں لائے اور بے دھڑک اپنے کمرے میں گھس گئے۔ دونوں سہیلیاں ایک ہی پلنگ پر لیٹی باتیں کر رہی تھیں۔ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پورنا کا سر کھلا ہوا تھا۔ شرم کے مارے اس کے جسم میں پسینہ آ گیا۔ سومترا نے شوہر کی طرف غصہ بھری نگاہوں سے دیکھا۔

کملا نے کہا۔’’ارے پورنا بھی یہیں ہیں۔ معاف کرنا پورنا مجھے معلوم نہ تھا۔ یہ دیکھو سومترا، دو ساڑیاں لایا ہوں۔ سستے داموں میں مل گئیں۔ ایک تم لے لو اور ایک پورنا کو دے دو۔‘‘

سومترا نے ساڑیوں کو بے چھوئے ہی کہا، ان کی تو آج کوئی ضرورت نہ تھی۔ میرے پاس ساڑیوں کی کوئی کمی نہیں ہے اور پورنا ریشمی ساڑیاں پہننا چاہیں گی تو میں اپنی نئی ساڑیوں میں سے ایک دے دوں گی۔’’کیوں بہن! ان میں سے لوگی کوئی ساڑی؟‘‘

پورنا نے سر ہلا کر کہا۔’’نہیں، ریشمی لے کر کیا کروں گی؟‘‘

کملا ۔ ’’کیوں ریشمی ساڑی تو کوئی چھوت کی چیز نہیں۔‘‘

سومترا ۔ ’’چھوت کی چیز نہیں مگر شوق کی چیز تو ہے۔ سب سے پہلے تو تمھاری والدہ ماجدہ ہی چھاتی پیٹنے لگیں گی۔‘‘

کملا ۔ ’’مگر اب تو میں لوٹانے نہ جاؤں گا۔ بزاز سمجھے گا دام سن کر ڈر گئے۔‘‘

سومترا ۔ ’’بہت اچھی ہوں تو پریما کے پاس بھیج دوں۔ تمھاری خریدی ہوئی ساڑھی پا کر اپنا بھاگ سراہیں گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج کل کہیں کوئی رقم مفت ہاتھ آ گئی ہے۔ سچ کہنا کس کی گردن ریتی ہے؟ گانٹھ کے روپے خرچ کر کے تم ایسی بے کار چیز کبھی نہ لیتے ہوگے۔‘‘ کملا نے غضب آلود نگاہوں سے سومترا کی طرف دیکھ کر کہا۔’’تمھارے باپ کی تجوری توڑی ہے اور بھلا کہاں

© NCERT not to be republished

ڈاکہ ڈالنے جاتا؟''

سومترا - ''مانگتے تو وہ یوں بھی دے دیتے۔ تجوری توڑنے کی نوبت نہ آتی۔ مگر عادت کو کیا کرو۔''

کملا نے پورنا کی طرف منہ کرکے کہا۔''سنتی ہو پورنا، ان کی باتیں! شوہر سے باتیں کرنے کا یہی طریقہ ہے؟ تم بھی انھیں نہیں سمجھاتیں۔ اور کچھ نہ سہی تو آدمی سیدھے منہ بات تو کرے۔ جب سے تم آئی ہو ان کا دماغ اور بھی آسمان پر چڑھ گیا ہے۔''

پورنا کو سومترا کی سختی بری معلوم ہو رہی تھی۔ تنہائی میں کملا پرشاد سومترا کو جلاتے ہوں، مگر اس وقت سومترا ہی انھیں جلا رہی تھی۔ اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں کملا مجھ سے ناراض ہو گئے تو مجھے اس گھر سے نکلنا پڑے گا۔ کملا کو ناراض کرکے یہاں ایک دن بھی نباہ نہیں ہو سکتا، وہ یہ جانتی تھی اس لیے وہ سومترا کو سمجھاتی رہتی تھی، بولی۔''میں تو برابر سمجھایا کرتی ہوں۔ بابو جی پوچھ لیجیے۔ جھوٹ کہتی ہوں۔''

سومترا نے تیز لہجہ میں کہا۔''ان کے آنے سے میرا دماغ کیوں آسمان پر چڑھ گیا، ذرا یہ بھی بتادو، مجھے انھوں نے راج گدّی پر نہیں بٹھا دیا تھا۔ ہاں تب اکیلی پڑی رہتی تھی۔ اب گھڑی دو گھڑی ان کے ساتھ بیٹھ لیتی ہوں۔ کیا تم سے اتنا بھی نہیں دیکھا جاتا؟''

کملا - ''تم فضول بات بڑھاتی ہو سومترا! میں یہ کب کہتا ہوں کہ تم ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ترک کر دو۔ میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کہی۔''

سومترا - ''اور کہنے کا مطلب ہی کیا ہے کہ جب سے یہ آئی ہیں، تمھارا دماغ آسمان پر چڑھ گیا ہے؟''

کملا - ''کچھ جھوٹ کہہ رہا ہوں؟ پورنا خود دیکھ رہی ہیں۔ تمھیں ان کی نیک صحبت سے کچھ اچھی باتیں سیکھنی چاہیے تھیں۔ یہاں انھیں لاکر رکھنے میں میرا ایک مقصد یہ بھی تھا مگر تم پر ان کی صحبت کا الٹا ہی اثر ہوا۔ یہ بیچاری سمجھاتی ہوں گی مگر تم کیوں ماننے لگیں؟ جب تم مجھی کو کچھ نہیں گنتیں تو یہ بے چاری کس گنتی میں ہیں؟ بھگوان سب کچھ دے مگر برے کا ساتھ نہ دے۔ تم ان میں سے ایک ساڑھی رکھ لو پورنا۔ دوسری میں پریما کے پاس بھیجے دیتا ہوں۔''

سومترا نے دونوں ساڑیوں کو اٹھا کر دروازہ کی طرف پھینک دیا۔ دونوں کاغذ میں تہہ کی ہوئی رکھی تھیں۔ صحن میں جا کر گریں۔ مہری اس وقت صحن دھو رہی تھی، جب تک وہ دوڑ کر ساڑیاں اٹھائے، کاغذ بھیگ گیا اور ساڑیوں میں داغ پڑ گئے۔ پورنا نے حقارت کے لہجہ میں کہا۔''بہن دیکھو تو ساڑیاں خراب ہو گئیں۔''

کملا -''ان کی کرتوتیں دیکھتی جاؤ۔ اس پر میں ہی برا ہوں۔ مجھی میں دنیا بھر کے عیب ہیں۔''

سومترا -''تو لے کیوں نہیں جاتے اپنی ساڑیاں؟''

کملا ۔ ’’میں تمھیں تونہیں دیتا۔‘‘
سومترا ۔ ’’پورنا بھی نہ لیں گی۔‘‘
کملا ۔ ’’تم ان کی طرف سے بولنے والی کون ہوتی ہو؟ تم نے اپنا ٹھیکہ لیا ہے یا زمانے بھر کا؟ بولو پورنا، ایک رکھ دوں نا؟ یہ سمجھ لو کہ تم نے انکار کر دیا تو مجھے بڑا رنج ہوگا۔‘‘

پورنا بڑے شش و پنج میں پڑ گئی، اگر ساڑی لیتی ہے تو سومترا کو برا لگتا ہے، اگر نہیں لیتی تو کملا برا مانتے ہیں۔ سومترا! کیوں اتنی ہٹ کر رہی ہے۔ کیوں اتنا جامے سے باہر ہو رہی ہے، یہ بھی اس سے پوشیدہ نہ رہا۔ دونوں پہلوؤں پر غور کر کے اب اس نے سومترا ہی کو خوش رکھنے کا ارادہ کر لیا۔ کملا روٹھ کر اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، زیادہ سے زیادہ اسے یہاں سے چلا جانا پڑے گا۔ سومترا ناراض ہو گئی تو نہ جانے کیا غضب ڈھائے، نہ جانے اس کے دل میں کیسے کیسے برے خیالات پیدا ہوں، بولی: ’’بابو جی ریشمی ساڑیاں پہننے کی مجھے مناہی ہے، تو لے کر کیا کروں گی؟ ایسا ہی ہے تو کوئی موٹی مہین دھوتی لا دیجیے گا۔‘‘

یہ کہہ کر اس نے کملا پرشاد کی طرف معذور نگاہوں سے دیکھا۔ ان میں کتنی عاجزی، کتنی معذوری بھری ہوئی تھی گویا وہ کہہ رہی تھیں کہ لینا تو چاہتی ہوں مگر لوں کیسے؟ انھیں آپ دیکھ رہے ہیں۔ کیا گھر سے نکالنے کی خواہش ہے؟

کملا پرشاد نے کوئی جواب نہ دیا۔ ساڑیاں چپکے سے اٹھا لیں اور پیر پٹکتے ہوئے باہر چلے گئے۔

(پریم چند)

مشق

سوالات

1. پریم چند کی ناول نگاری کی خصوصیات پر ایک تنقیدی مضمون لکھیے۔
2. ناول ”بیوہ“ کے اہم کردار کون سے ہیں اور پریم چند ان کی عکاسی میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں؟
3. ناول ”بیوہ“ کے ذریعے پریم چند ہمیں کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟ وضاحت کیجیے۔

© NCERT not to be republished